پیرایہ بیان دلآویز ہے، ہندو یونیورسٹی کے استاذ ڈاکٹر مسعود الرحمٰن ازہری کے مضمون میں حافظ ابن کثیر کی مخطوطہ کتابوں کے متعلق اگر یہ تصریح بھی کر دی گئی ہوتی کہ وہ کن کتبخانوں میں موجود ہیں تو مقالہ زیادہ مفید اور بلند پایہ ہو جاتا، یہ رسالہ دینی علمی، اور تحقیقی مختلف النوع سنجیدہ و باوقار مضامین پر مشتمل، زبان و بیان، اسلوب تحریر اور طرز استدلال وغیرہ کی حیثیت سے خاصا دلکش اور بعض حیثیتوں سے ہندوستان سے شائع ہونے والے گنے چنے عربی رسائل میں ممتاز ہے، ہم اس کار نیک کا خیر مقدم کرتے اور عربی زبان و ادب سے دلچسپی رکھنے والے حلقہ سے اسکی پذیرائی کی پرزور سفارش کرتے ہیں،

تعمیر فکر، ایڈیٹر مولوی محمد شہاب الدین صاحب ندوی، متوسط سائز، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر صفحات ۳۲ قیمت فی پرچہ ۵۰ پیسے، سالانہ ۵ر پتہ ماہنامہ تعمیر فکر ۱۲۴، پولیس روڈ، بنگلور ۲،

مولوی محمد شہاب الدین ندوی اپنے قرآنی سائنسی مضامین و تصنیفات سے علمی حلقہ میں متعارف ہو چکے ہیں، انھوں نے جنوبی ہند میں تصنیف و تالیف کا ذوق پیدا کرنے کے لئے یہ رسالہ جاری کیا ہے، جو مئی ۱۹۷۲ء سے پابندی سے شائع ہو رہا ہے، مضامین متنوع اصلاحی و دینی، معلوماتی، عام فہم اور مختصر ہوتے ہیں، مارچ و اپریل ۱۹۷۳ء میں مسلم پرسنل لا نمبر مع بمبئی کنونشن کے نام سے اس کا خاص نمبر شائع کیا گیا ہے، جو بمبئی کنونشن کی روداد، اور خطبوں کے علاوہ مسلم پرسنل لا پر مفید مضامین پر مشتمل ہے، ہم رسالہ کی بقا اور اس کے مقاصد کی کامیابی کے لئے دعا کرتے ہیں،

"ض"

جلد ۱۱ ماہ جمادی الاولیٰ ۱۳۹۳ھ مطابق ماہ جون ۱۹۷۳ء عدد ۶

مضامین

شذرات

مشرقی نظام تعلیم میں تربیت بھی تعلیم کا ایک ضروری جزو تھی، ہماری درسگاہیں تعلیم کے ساتھ تہذیب و شائستگی اور سیرت و کردار کی بھی تربیت گاہیں تھیں، طلبہ اُس کا نمونہ ہوتے تھے، مگر ہندوستان کی آزادی نے دوسرے طبقوں کی طرح طلبہ کو بھی ہر قید سے آزاد کر دیا، کالج اور یونیورسٹیاں تعلیم و تربیت کے بجائے شورش اور ہنگامہ آرائی کا آماجگاہ بن گئیں، ان میں آئے دن ہنگامے ہوتے رہتے ہیں جن میں اساتذہ، پرنسپل اور وائس چانسلر کی کوئی درگت باقی نہیں رہتی، گذشتہ مہینہ لکھنؤ یونیورسٹی میں جو ہنگامہ ہوا وہ سب پر بازی لے گیا، یونیورسٹی کا بہت سا قیمتی سامان اور پُرانے ریکارڈ طلبہ نے نذر آتش کر دیئے، جس سے لاکھوں روپئے کا نقصان ہوا، دیکھنا ہے کہ حکومت لکھنؤ یونیورسٹی کے ساتھ کیا معاملہ کرتی ہے،

....

اس صوبہ میں ایک دوسری یونیورسٹی بھی ہے جس کے طلبہ کا ضبط و نظم آج بھی مسلّم ہے، انھوں نے کبھی قسم کی شورش و ہنگامہ آرائی نہیں کی، اساتذہ اور وائس چانسلر سے کوئی گستاخی کی، نہ یونیورسٹی کے سامان کو نقصان پہنچایا، صرف مسلم یونیورسٹی کے جابرانہ اور غیر جمہوری ایکٹ کے خلاف پُرامن احتجاج کیا، اس کی ان کو سزا دی گئی کہ عین امتحان کے زمانہ میں یونیورسٹی بند کر دی گئی، امتحانات ملتوی کر دئے گئے، پی ۔ سی کی نگرانی میں ہوسٹل خالی کرائے گئے، جس سے اُن کا ایک سال برباد ہوا، بہت سے طلبہ کا یونیورسٹی سے اخراج کر دیا گیا، یونیورسٹی کے باہر جن لوگوں نے ایکٹ کے

خلاف ستیہ گرہ کی جن میں ہندو مسلمان دونوں شامل ہیں، اُن کو قید کر دیا گیا، (اس تحریر کے وقت وہ لوگ چھوڑ دیئے گئے) یہ ہے ایک سیکولر حکومت کا کارنامہ جو سارے فرقوں کے ساتھ یکساں سلوک کی مدعی ہے، وزیر تعلیم بھی جو مسلم یونیورسٹی میں اپنے جلال و جبروت کا پورا مظاہرہ کر چکے تھے، خاموش ہیں،

....

اس سلسلہ میں اصل غور طلب مسئلہ یہ ہے کہ طلبہ کی اس شورش اور خیرہ سری کے اسباب کیا ہیں، یہ وہی طلبہ ہیں، تہذیب و شائستگی اور استاد کی اطاعت و احترام جن کا شعار تھا، اب بغاوت و سرکشی اُن کا شعار بن گیا ہے، درحقیقت اس میں ہمارا خود قصور ہے، ہم نے آزادی سے غلط فائدہ اٹھایا، اس کی ذمہ داریوں کو تو بھلا دیا صرف اس کے فوائد کی فکر میں لگ گئے، اور اس کے لئے اخلاق و سیرت اور ضبط و نظم سب کو پس پشت ڈال دیا، بلکہ اس کو بھی دور غلامی کی یادگار سمجھ کر اس سے آزادی حاصل کر لی، اس میں جو کسر رہ گئی تھی وہ کمیونزم نے پوری کر دی جس کا مقصد ہی تخریب اور ہر جائز و ناجائز وسیلہ سے اقتدار کا حصول ہے، سیاسی پارٹیوں خصوصاً کمیونسٹوں نے یہی سبق طلبہ کو سکھایا اور ان کو اپنے اغراض کے لئے استعمال کیا، اور اب وہ اس سبق کو یونیورسٹی میں دہرا رہے ہیں،

....

دوسرا سبب یہ ہے کہ ملک کی مادی ترقی کے لئے تو ہم نے بڑے بڑے منصوبے بنائے لیکن قوم کے اخلاق اور سیرت کی تعمیر کی طرف کوئی توجہ نہ کی، بلکہ اُس کی جو پرانی روایت چلی آرہی تھی، اس کو بھی آزادی اور سیکولرزم کے غلط تصور نے ختم کر دیا، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ پورا ملک اخلاقی بحران کا شکار ہے، دولت اور جاہ اقتدار کا حصول زندگی کا نصب العین

بن گیا ہے، ہر طبقہ زیادہ سے زیادہ دولت سمیٹنے کی فکر میں ہے، نیچے سے اوپر تک بے عنوانی اور بددیانتی کا بازار گرم ہے، جس سے نہ صرف عوام مصیبت میں مبتلا ہیں بلکہ حکومت کا پورا نظام بگڑ کر رہ گیا ہے، اور اب یہ وبا اتنی عام ہو چکی ہے کہ اگر حکومت اس کی اصلاح کرنا بھی چاہے تو نہیں کر سکتی۔ جب پاسبان خود رہزن بن گئے ہوں تو حکومت کس کے ذریعہ اصلاح کرے گی۔ چنانچہ ان حالات کی اصلاح کے لئے وہ جو قدم بھی اٹھاتی ہے اس میں کامیاب نہیں ہوتی۔

قومیں محض مادی ترقی کے سہارے زندہ نہیں رہتیں، قومی اور ملکی عمارت کا سب سے بڑا ستون کیرکٹر اور سیرت و کردار ہے، جو قوم اس سے محروم ہوگئی وہ زندگی کی طاقت سے محروم ہوگئی، مغربی قوموں کے عروج و ترقی میں جن کے ہم اندھے مقلد ہیں، ان کے مادی وسائل کے ساتھ ان کے کیرکٹر کی پختگی کو بھی دخل ہے، ان میں اور جو برائیاں بھی ہوں، مگر اپنے قومی و ملکی معاملات میں ان کے ایثار و قربانی، دیانت و راست بازی، عدل و مساوات، جانکاہی و جفاکشی وغیرہ سے کون انکار کر سکتا ہے، درحقیقت ان کے انہی اوصاف نے ان کو بام عروج تک پہنچایا ہے، اور ان کی مادی ترقی بھی اسی کا نتیجہ ہے جس کا ہمارے یہاں فقدان ہے، گاندھی جی کا تصور آزادی یہی تھا، اور وہ اسی قسم کے اوصاف ہندوستانیوں میں پیدا کرنا چاہتے تھے، جن کی عمر بھر تلقین کرتے رہے، اگر وہ زندہ رہتے، تو مادی منصوبوں سے زیادہ اخلاقی منصوبوں پر زور دیتے، جب تک گاڑی کے یہ دونوں پہیے برابر نہ ہوں گے، ملک صحیح معنوں میں ترقی نہیں کر سکتا۔

مقالات

کیا موجودہ دنیا کو مذہب کی ضرورت نہیں رہی؟

از شاہ معین الدین احمد ندوی

مادہ پرستوں کا دعویٰ ہے کہ خدا اور مذہب کا تصور اس دور کی پیداوار ہے جب انسانی عقل و شعور ناقص تھا، کائنات اسکے لئے معمہ تھی، اسکی عقل اسکی پیدائش کے طبعی علل و اسباب اور اسکی ترتیب و نظام کے ادراک سے قاصر تھی، اس لئے اس نے اس کے پیچھے ایک مافوق الادراک ہستی کارفرما مان لی، جس نے پہلے دیوی دیوتا پھر ترقی کر کے خدا کی شکل اختیار کر لی، اور بعد کے ذہین انسانوں نے انسانی معاشرہ میں عدل اور نظم قائم رکھنے کے لئے مذہب ایجاد کیا، مگر اب اس زمانہ میں جب انسانی عقل و شعور کمال کو پہنچ گئے ہیں سائنس نے کائنات کا معمہ حل کر لیا ہے، اس کے اسرار منکشف ہو گئے ہیں، اور انسان آپ اپنی قسمت کا مالک بن گیا ہے، اسکو خدا اور مذہب کی ضرورت باقی نہیں رہی، اسکے علاوہ مذہب نے انسانوں میں اختلاف و تفریق پیدا کی، اس کے نام سے بڑی خونریزیاں ہوئیں اس لئے مروجہ مذاہب کے بجائے ایک عالمگیر بین الاقوامی مذہب کی ضرورت ہے، جس کی بنیاد خدا کے بجائے انسان دوستی پر ہو، اس کا نام انھوں نے مذہب انسانیت رکھا ہے،

لیکن یہ سارے مقدمات محض مفروضات ہیں جن کی کوئی حقیقت نہیں، خدا کی طلب انسانی فطرت میں ہے، اور مذہب کی ضرورت اسی وقت سے ہے، جب انسان نے پہلی مرتبہ زمین پر قدم رکھا تھا، یا نظریۂ ارتقاء کی زبان میں جب حیوانیت نے انسان کی شکل اختیار کی تھی، لیکن ابتداء میں اسکی محدود عقل خدا کا صحیح تصور قائم نہیں کر سکتی تھی اس لیے اس نے کائنات کی ہر اس مخلوق کو جس سے اسکے گمان میں فائدہ پہنچنے کی امید یا نقصان پہنچنے کا خطرہ تھا، اسکی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اسکو خدا مان لیا تھا، پھر جس قدر اس کی عقل ترقی کرتی گئی، خدا کا صحیح تصور پیدا ہوتا گیا، اور خدا کے خاص بندوں کو اس کا عرفان حاصل ہوگیا، اور اس نے ان کو انسانوں کی ہدایت و رہنمائی کے لئے مامور فرمایا جنھوں نے خدا کا صحیح تصور پیدا کیا، اور انسانی عقل و شعور اور اس کے حالات و ضروریات کے مطابق خدا کا پیام لاتے رہے، اس کے لئے تنہا ذہانت و طباعی کافی نہیں، بلکہ مامور من اللہ ہونا ضروری ہے، اس کے بغیر کوئی بڑا روحانی اور اخلاقی انقلاب پیدا نہیں پیدا کیا جا سکتا، چنانچہ ذہین انسانوں نے جو مذاہب و فلسفے ایجاد کئے، اور اخلاقی مصلحین نے جو اصلاحیں کیں اس کا اثر وقتی تھا، وہ کوئی دیرپا اخلاقی انقلاب نہ پیدا کر سکے، اور نہ اپنی تعلیمات کا عملی نمونہ کوئی جماعت بنا سکے، ان کے بعد ان کے مذاہب و اصلاحات ختم ہوگئیں اور ان کا درس اخلاق محض کتابوں میں باقی رہ گیا، چنانچہ آج کسی اخلاقی مصلح کی پیدا کردہ کوئی جماعت دنیا میں موجود نہیں ہے، اخلاق و روحانیت کی جو روشنی بھی نظر آتی ہے وہ صرف انبیاء علیہم السلام کا فیض ہے، یہ بھی صحیح نہیں، کہ مذہب انسان کی بے شعوری کے دور کی پیداوار ہے، زردشتیت، ہندویت، بدھزم، یہودیت، عیسائیت اور اسلام وغیرہ دنیا کے تمام بڑے بڑے مذاہب اس زمانہ پیدا ہوئے، جب یونان کا فلسفہ اور ایران و روم کی

تہذیبیں عروج پر تھیں بلکہ بعض تہذیبیں اپنا دور پورا کر کے مٹ چکی تھیں، اسلئے یہ کہنا کہ مذہب انسان کی بے شعوری اور کم عقلی کے دور کی پیداوار ہے، سراسر غلط ہے، خود ان مذاہب کے لانے والے اپنے اپنے دور کے عاقل ترین انسان تھے،

یہ دعویٰ بھی صحیح نہیں کہ سائنس نے کائنات کا معمہ حل کر لیا ہے، البتہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس نے کرۂ ارضی کے کچھ حقائق معلوم کر لئے ہیں اور ان کی تحقیق کا سلسلہ برابر جاری ہے، آئے دن نئے نئے انکشافات ہوتے رہتے، اور پرانے نظریات بدلتے رہتے ہیں، اسلئے کسی انکشاف اور تحقیق کو آخری نہیں کہا جا سکتا اور جو انکشافات اب تک ہو چکے ہیں، نامعلوم اسرار کے مقابلہ میں ان کی حیثیت سمندر کے ایک قطرہ کی ہے،

یہ بھی ہماری کم نظری ہے کہ ہم نے کائنات کو کرۂ ارضی میں محدود کر دیا ہے، جن کی حیثیت پوری کائنات کے مقابلہ میں ایک ذرہ سے زیادہ نہیں ہے، پوری کائنات یعنی ان گنت دنیاؤں اور اربوں کھربوں نجوم و کواکب اور ان کے نظام شمسی کا پورا علم بھی انسان کو حاصل نہیں، وہ اسکی بے کراں وسعت و عظمت کا تصور بھی نہیں کر سکتا اور سائنس اپنی بے پناہ ترقیوں اور طاقتور دوربین اور خوردبین آلات کے باوجود ان کے احاطہ سے قاصر ہے،

یہ بھی واضح رہے کہ ان دنیاؤں اور نجوم و کواکب کے قوانینِ فطرت کرۂ ارض کے قوانین سے بالکل جدا ہیں، جو زمین سے چند ہی میل کی بلندی پر بدل جاتے ہیں، اسلئے زمین کے قوانین پر ان کا قیاس نہیں کیا جا سکتا، اور کرۂ ارض کے نظام کی طرح ان کا مکمل نظام ہے اس لئے محض کرۂ ارض کے بارہ میں محدود علم پر یہ دعویٰ کہاں تک صحیح ہے، کہ سائنس نے کائنات کا معمہ حل کر لیا،

کائنات کی وسعت و پہنائی اتنی بے کراں اور اس کے عجائبات اتنے بے حد و نہایت ہیں کہ ظن و تخمین کے سوا اس کا ادراک کیا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، اور اس کی ایک جھلک دیکھ کر صاحب بصیرت سائنسٹ بھی "ربنا ما خلقت ھذا باطلا سبحانک فقنا عذاب النار"[1] کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں، یہ بھی علی الاطلاق صحیح نہیں ہے کہ انسان سو فیصدی اپنی قسمت کا

لہ اس بے پایاں کائنات کا نظام اتنا مکمل اور حیرت انگیز ہے کہ کوئی مخلوق قدرت کے مقرر کردہ ضابطہ سے باہر نہیں نکل سکتی، درخت کی پتی اور پانی کے ایک قطرہ سے لیکر بڑے بڑے ہیبتناک سیاروں تک ان ضابطوں کے پابند ہیں، اگر اس نظام میں ادنیٰ فرق آجائے تو سارا کارخانہ عالم درہم ہو جائے، بے شمار اجرام فلکی اپنے اپنے دائرہ میں حرکت کرتے رہتے ہیں، اگر ذرا بھی اس سے ہٹ جائیں تو آپس میں ٹکرا کر تباہ ہو جائیں، کرہ ارض کی ساخت میں اگر ذرا بھی فرق آجائے تو سمندر میں غرق ہو جائے، اگر اس کی کشش میں فرق آجائے تو کوئی چیز اپنی جگہ قائم نہ رہے، زمین کی اندرونی سطح میں ذرا بھی تغیر آتا ہے تو ہلاکت خیز زلزلے آجاتے ہیں، اگر آفتاب کی حرارت مقررہ مقدار سے بڑھ جائے تو ساری مخلوق جل کر خاکستر ہو جائے، اگر گھٹ جائے تو ٹھنڈک سے ٹھٹھر کر رہ جائے، اگر ہوا پانی کے اجزاء میں تغیر آجائے تو ایک متنفس بھی زندہ نہ رہے، اسی طرح ایک حقیر دانہ سے لیکر بڑی سی بڑی مخلوق کی زندگی اور نشو و نما کے لئے جن چیزوں کی ضرورت ہے، سب موجود ہیں، اور جن پر انسانی زندگی کا مدار ہے مثلاً پانی ہوا، آفتاب کی گرمی ہر جگہ موجود ہے، اور اسکی بخشش عام ہے،

حیوانی جسم کی مشنری قدرت نے اتنی پیچیدہ بنائی ہے کہ دنیا کی کوئی مشین اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی اور اس کی ساخت ایسی رکھی کہ اسکے پرزے خود بخود حرکت اور اپنا عمل کرتے رہتے ہیں اگر انسان اس کو روکنا بھی چاہے تو اس پر قادر نہیں، مثلاً قلب کی حرکت اور پھیپھڑوں سے تنفس پر جس پر زندگی کا مدار ہے، انسان مجبور و مضطر ہے، اگر اسکو روکنے کی کوشش کریگا، تو دم گھٹ کر

آپ مالک بن گیا ہے، یہ صحیح ہے کہ پہلے کے مقابلہ میں اب جلب منفعت اور دفع مضرت کے بہت سے وسائل پیدا ہو گئے ہیں، اور جو چیزیں پہلے انسانی دسترس سے باہر سمجھی جاتی تھیں اب ان پر قابو حاصل ہو گیا ہے، اس کے باوجود انسان بہت سے معاملات میں مجبور محض ہے، اور اب بھی انفرادی اور اجتماعی دونوں حیثیتوں سے آئے دن ایسے حوادث پیش آتے رہتے ہیں جن کا روکنا انسانی بس سے باہر ہے، اسکی مثالیں بھی نادر نہیں کہ بڑے بڑے عاقل و فرزانہ اور اسباب و وسائل رکھنے والے زندگی کی دوڑ میں ناکام رہتے ہیں، اور ان سے کم عقل اور بے وسیلہ آگے بڑھ جاتے ہیں، کروڑپتی دوالیہ ہو جاتے ہیں اور مفلس محتاج کروڑپتی بن جاتے ہیں، اس لئے یہ کہنا صحیح نہیں کہ انسان اپنی قسمت کا آپ مالک بن گیا ہے، اس کی کنجی آج بھی کسی دوسری طاقت کے ہاتھ میں ہے،

(بقیہ حاشیہ ص ۴۰۸) مر جائے گا، سارے حیوانات خصوصاً انسانی جسم کی ساخت قدرت کا شاہکار ہے، جس کو قرآن مجید نے وَفِي أَنفُسِكُمْ أَفَلَا تُبْصِرُونَ سے تعبیر کیا ہے، ایک ایک عضو کے عمل اور اس سے متعلقہ فائدہ کے حصول کے لئے ہزاروں عضلات اور رگ و پٹھے کام کرتے ہیں، اگر ایک عضلہ بھی بیکار ہو جائے تو وہ عضو معطل ہو جائے گا، یہی حال ساری کائنات کے نظام کا ہے، کیا یہ سارا کارخانہ اور اس کا عجیب نظام ایک بے حس مادہ کا نتیجہ ہے، اور بغیر کسی صانع کے خود بخود پیدا ہو گیا اور چل رہا ہے، اس کو کون عقل باور کر سکتی ہے، اسی لئے انسان کی عبرت و بصیرت اور اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کے مشاہدہ کے لئے قرآن مجید نے کائنات کے نظام پر غور و فکر پر زور دیا ہے،

یہ بھی صحیح نہیں کہ مذہب نے انسانوں میں تفریق و اختلاف پیدا کیا، اسلام جو سارے مذاہب کی اچھی تعلیمات کا جامع ہے، انسانی وحدت و اخوت اور مساوات کا سب سے بڑا داعی ہے، اسکی تعلیم ہے کہ الخلق کلھم عیال اللہ ساری مخلوق خدا کا کنبہ ہے، اسلئے اسکی نگاہ میں انسان کی حیثیت سے سب برابر ہیں، اسکے نزدیک انسانی فضیلت کا معیار نسب و خاندان نہیں بلکہ تقویٰ و پرہیزگاری ہے، ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم، اسی نے اسکے سر پر عظمت و شرف کا تاج رکھا اور اسکی بنیاد توحید پر ہے، وہ جس طرح خدا کی عظمت و کبریائی کا اعتراف ہے، اسی طرح انسانی عظمت و شرف کا بھی سنگ اساس ہے، اسی نے انسانوں کو اسکے ہم جنسوں اور معبودان باطل کی غلامی سے آزاد کرکے مخلوق میں اس کا مرتبہ بلند کیا اور یہ تصور بھی پیدا کیا کہ سارے انسانوں کا خالق خدا ہے، اس رشتہ سے وہ سب بھائی بھائی ہیں، اور یہ حکم دیا کونوا عباد اللہ اخوانا سب خدا کے بندے بھائی بھائی بن جاؤ، اسکی مزید تفصیل آگے آئیگی، اسلئے سارے الہامی مذاہب کی بنیادی تعلیم توحید ہے، خدا کے تمام پیغمبر اسی کی تعلیم دیتے چلے آئے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب ہے،

وما ارسلنا من قبلک من	اور ہم نے تم سے پہلے جتنے رسول بھی بھیجے
رسول الا یوحی الیہ انہ	سب کو یہی وحی کی کہ میرے سوا
لا الٰہ الا انا فاعبدون،	کوئی معبود نہیں اسلئے میری ہی پرستش کرو

اسلام کا مقصد اسی کا احیاء تھا، چنانچہ ان مذاہب کو جن سے توحید مٹ چکی تھی، اس کی دعوت دی

یا اھل الکتاب تعالوا الی کلمۃ	اے اہل کتاب آؤ ہم تم ایک بات پر
سواء بیننا و بینکم ان لا	متفق ہو جائیں جو ہمارے اور تمہارے درمیان

نعبد الا اللہ ولا نشرک بہ	یکساں ہے کہ ہم تم اللہ کے سوا کسی کی
شیئا ولا یتخذ بعضنا بعضاً	پرستش نہ کریں اور نہ کسی کو اس کا شریک
اربابا من دون اللہ	ٹھہرائیں اور نہ اللہ کے سوا ایک دوسرے کو

اس لئے اگر اصل بنیاد میں اتفاق ہو تو منہاج و شریعت کے اختلاف کی جس کو انسانوں میں تفریق و اختلاف سے تعبیر کیا جاتا ہے، کوئی اہمیت نہیں، وہ بالکل فطری اور ناگزیر ہے، جب سے مذہب کی تاریخ شروع ہوتی ہے مختلف زمانوں کے انسانوں کی عقل و شعور تہذیب و تمدن میں اختلاف رہا ہے، ان میں پیدا شدہ خرابیاں اصلاح طلب باتیں اور دوسری ضروریات بھی جدا جدا رہی ہیں، انکے اعتبار سے منہاج و شریعت کی شکلیں بھی بدلتی رہی ہیں، اسی اصول پر دنیاوی قوانین بھی بنتے ہیں، اسی لئے مختلف قوموں کے قوانین میں فرق ہوتا ہے، مگر ان سب کا بنیادی مقصد یعنی معاشرہ میں نظم و عدل کا قیام مشترک ہوتا ہے، یہی شکل توحید اور منہاج و شریعت کی ہے، اصل الاصول توحید ہے جسکی تعلیم سارے انبیاء علیہم السلام دیتے چلے آئے ہیں، اور منہاج و شریعت ہر قوم کے حالات اور ضروریات کے مطابق زندگی بسر کرنے کا دستور ہے، کلام مجید کا ارشاد ہے،

ولکل جعلنا منکم شرعۃ	اور ہم نے تم میں سے ہر ایک (قوم)
ومنھاجا،	کے لئے (زندگی) کا ایک دستور بنایا،

اس کے مطابق عبادت کے طریقے بھی مختلف ہیں، اسلئے وہ کوئی جھگڑے کی چیز نہیں،

ولکل جعلنا منسکا ھم ناسکوہ	ہم نے ہر قوم و قبیلہ کے لئے عبادت کا ایک
فلا ینازعنک فی الامر وادع	طریقہ مقرر کیا، جس کی وہ پابندی کرتے
الی ربک انک لعلی	ہیں، اس لئے اس معاملہ میں لوگ تم سے

ھدی مستقیم،

جھگڑا نہ کریں تم اپنے رب کی طرف بلاتے رہو، بیشک تم ہدایت کی سیدھی

جھگڑا اور اختلاف لوگوں نے محض ضد اور تعصب کی وجہ سے پیدا کیا،

وما تفرقوا الا من بعد ما جاءھم العلم بغیا بینھم

لوگوں نے اختلاف اور تفرقہ وحی کا علم حاصل ہونے کے بعد محض ضد اور تعصب سے پیدا کیا ہے

اور ہر فرقہ اس کا مدعی بن گیا کہ وہی صحیح راہ پر ہے، دوسرے گمراہ ہیں،

قالت الیھود لیست النصاریٰ علیٰ شیٔ وقالت النصاریٰ لیست الیھود علیٰ شیٔ وھم یتلون الکتاب،

یہودیوں نے کہا کہ نصاریٰ کسی راہ پر نہیں ہیں اور نصاریٰ نے دعویٰ کیا کہ یہود کسی راہ پر نہیں ہیں، حالانکہ دونوں اللہ کی کتاب پڑھتے ہیں،

اسلام نے ان سب تفرقوں کو مٹا دیا، اور سارے انبیاء علیہم السلام اور ان کی کتابوں پر ایمان لانا ضروری قرار دیا، مسلمانوں کو حکم ہوا،

قولوا آمنا باللہ وما انزل الینا وما انزل الیٰ ابراھیم واسمٰعیل واسحٰق ویعقوب، والاسباط وما اوتی موسیٰ وعیسیٰ وما اوتی النبیون من بعدھم،

اے مسلمانو! تم کہو کہ ہم ایمان لائے ہیں جو ہمارے لئے اتارا گیا (قرآن مجید) اور جو ابراہیم اور اسمٰعیل اور اسحٰق اور یعقوب پر اتارا گیا، اور جو موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا گیا اور جو ان کے بعد کے نبیوں کو دیا گیا،

جو لوگ سارے انبیاء اور ان کی کتابوں کو نہیں مانتے وہ کافر ہیں،

الذین یکفرون باللہ ورسلہ ویریدون ان یفرقوا بین اللہ ورسلہ ویقولون نؤمن ببعض ونکفر ببعض ویریدون ان یتخذوا بین ذالک سبیلا اولئک ھم الکافرون حقا،

بیشک جو اللہ اور اس کے رسولوں کا انکار کرتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان تفریق کرنا چاہتے ہیں، اور کہتے ہیں، کہ ہم بعض کو مانتے ہیں اور بعض کو نہیں مانتے اور اس کے درمیان ایک راہ نکالنا چاہتے ہیں وہ یقیناً کافر ہیں

قل کل آمنا باللہ وملٰئکتہ وکتبہ ورسلہ ولا نفرق بین احد من رسلہ،

آپ کہہ دیجئے کہ ہم سب ایمان لائے اللہ پر اور اسکے فرشتوں پر اور اسکی کتابوں پر اور اسکے رسولوں پر اور ہم اسکے رسولوں میں

اسی تفریق کو مٹانے کے لئے اسلام اور مسلمانوں کو یہودیوں اور عیسائیوں وغیرہ کی طرح کسی پیغمبر کی طرف منسوب نہیں کیا گیا، بلکہ خدا نے اس کا نام اسلام اور اس کے ماننے والوں کا نام مسلم رکھا" ھو الذی سماکم المسلمین" جس کے معنی خدا کی اطاعت و بندگی اور اس کے سامنے سرافگندگی ہیں جو مذہب کا اصل مقصود ہے، اس طرح اسلام نے مذہبی اختلاف کی جڑ کاٹ دی، اس کی نگاہ میں مسلمان یہودی نصاریٰ اور صابی وغیرہ جنھوں نے اپنے اپنے انبیاء کے زمانہ میں ان کی سچی تعلیمات پر عمل کیا یعنی توحید اور یوم آخرت پر ایمان لائے اور اچھے عمل کیے وہ سب صحیح راستہ پر ہیں اور ان کو ان کا اجر ملے گا،

ان الذین آمنوا والذین ھادوا والنصاریٰ والصابئین

بیشک جو ایمان لائے (مسلمان) جو یہودی ہوئے اور نصاریٰ اور صابی

من آمن باللہ والیوم الآخر	جو بھی خدا پر اور یوم آخرت پر ایمان
وعمل عملاً صالحاً فلھم اجرھم	لایا اور اچھے عمل کئے تو ان کا اجران کے
عند ربھم ولا خوف علیھم	پروردگار کے پاس ہے نہ ان پر کوئی
ولا ھم یحزنون	خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہونگے،

اس سے بڑھکر مذہبی اختلاف کو مٹانے کی تعلیم اور کیا ہوسکتی ہے، لیکن اسلام سے پہلے سارے مذاہب سے خالص توحید مٹ چکی تھی، جو قومیں توحید کی مدعی تھیں ان میں بھی کسی نہ کسی راہ سے شرک داخل ہوگیا تھا جسکا مشاہدہ آج بھی کیا جاسکتا ہے، اسلام نے اسکو دوبارہ زندہ کیا اسلئے توحید خالص کی تعلیم اب بھی اسی سے مل سکتی ہے اور طالب توحید کیلئے اسکے سوا کوئی آستانہ نہیں ہے،

مذہب کے نام پر بلاشبہہ خونریزیاں ہوئیں، لیکن اس کا ذمہ دار، مذہب نہیں ہے، سارے مذاہب میں انسانی جان کا بڑا احترام ہے، کوئی مذہب بھی ناحق کسی کی جان لینے کی اجازت نہیں دیتا بلکہ جانوروں تک کو ایذا دینا، اور بلا ضرورت ان کی جان لینا جائز نہیں ہے اسلام میں انسانی جان کا اتنا احترام ہے، کہ اس نے ایک انسانی جان کو ساری دنیا کی جان کے برابر قرار دیا ہے،

من قتل نفساً بغیر نفس او	جس نے خون ناحق کے بدلہ میں نہیں اور
فساد فی الارض فکانما قتل	نہ ملک میں فساد پھیلانے کی سزا میں
الناس جمیعاً ومن احیاھا	کسی کو قتل کیا، اس نے گویا تمام آدمیوں
فکانما احیا الناس جمیعاً،	کو قتل کیا، اور جس نے کسی ایک کی جان

[illegible]

یعنی مذہب میں کسی مقتول کے خون کے بدلے یا ملک میں بدامنی پھیلانے والوں کے علاوہ دوسرے کسی کو قتل کرنا جائز نہیں، اسی قانون پر ساری دنیا کا عمل ہے، اس لئے مذہب کے

نام سے جو خونریزیاں ہوئیں اس کی ذمہ داری مذہب پر نہیں بلکہ ان لوگوں پر ہے جنھوں نے اپنے اغراض کے لئے مذہب کو استعمال کیا،

جن لڑائیوں کو صحیح معنوں میں مذہبی لڑائیاں کہا جاسکتا ہے، ان کی تعداد بہت تھوڑی ہے، اور ان کا مقصد ملک گیری یا دوسروں کے ملک پر قبضہ کرنا نہیں تھا مذہب نے انہی لوگوں کے مقابلہ میں تلوار اٹھائی جو کسی قانون و اخلاقی ضابطے کے پابند نہ تھے بلکہ اخلاقی قدروں کے دشمن تھے، ان کی زندگی کا مقصد محض نفس پرستی تھا، جو زور قوت سے حق و صداقت کی آواز کو دبانا چاہتے تھے، جن کے ظلم و ستم نے پورے معاشرہ کا نظام درہم کر رکھا تھا اسلئے ان لڑائیوں کا مقصد خدا شناسی حق و صداقت اور اخلاق روحانیت کا احیاء ظلم و جور اور شر و فساد کا استیصال اور عدل و مساوات کا قیام تھا اس کی کوئی مثال نہیں پیش کیجاسکتی کہ کسی مذہب نے دنیاوی مقصد کے لئے جنگ کی ہو پھر اس نے یکبارگی تلوار نہیں اٹھائی، بلکہ پہلے حق کی دعوت دی افہام و تفہیم سے کام لیا، اس کے لئے ظلم و ستم بھی سہے، مگر اس کا جواب تشدد سے ملا، اور جب اس کا یقین ہوگیا کہ اگر قوت سے کام نہ لیا گیا تو حق کی آواز ہمیشہ کے لئے دب جائیگی، اس وقت اس نے مجبور ہوکر تلوار اٹھائی اگر اس وقت بھی وہ نرمی سے کام لیتا تو حق کی آواز ہمیشہ کے لئے دب جاتی اور اخلاق روحانیت اور نیکی و بھلائی کا خاتمہ اور شر و فساد کا دور دورہ ہوجاتا، اس لئے اس قسم کی لڑائیاں درحقیقت خونریزی نہیں بلکہ انسانیت کی بہت بڑی خدمت تھی، ع کار حق گاہ بہ شمشیر و سناں نیز کنند،

اس قسم کے حالات میں آج بھی قوت کے استعمال کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں ہے، پھر ان لڑائیوں کو ان خونریزیوں سے کوئی نسبت نہیں جو ملک گیری اپنی قوم کی

سیاسی و اقتصادی برتری اور اپنے نظریوں کی جبری اشاعت کے لئے کی جاتی ہیں، آج ایک ایک جنگ میں جتنی انسانی جانیں تلف ہوتی ہیں، اتنی مذہبی لڑائیوں کی پوری تاریخ میں نہ ہوئی ہونگی، اور ان کی بہیمیت اور درندگی کی مثال وحشی انسانوں کی لڑائیوں میں بھی نہیں مل سکتی، ان کے سامنے چنگیز و ہلاکو کے افسانے گرد ہیں، ان کے پاس ایسے ہلاکت خیز آلات و اسلحہ کہاں تھے، جو پُرامن آبادیوں اور بڑے بڑے شہروں کو چشم زدن میں خاک کا ڈھیر بنا دیں، جس سے ہر شخص واقف ہے، اسلئے غریب مذہب تو خونریزی کے لئے مفت بدنام ہے،

"مذہب انسانیت" بڑی خوبصورت مگر ظاہر فریب اصطلاح ہے، جس کے معنی کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہونگے، ممکن ہے اس کے مبلغوں کی نیت نیک ہو لیکن جب تک زندگی کے بارہ میں ان کا نقطۂ نظر نہ بدلے گا، اس قسم کی کوئی تحریک اجتماعی حیثیت سے کامیاب نہیں ہو سکتی، اور مادی نقطۂ نظر کے ساتھ اخلاق کا درس کبھی نتیجہ خیز نہیں ہو سکتا، جن قوموں کا تصور حیات خالص مادی اور جن کا مقصد اپنی قوم کی سربلندی اور بغیر کسی قید کے مادی تعیشات سے لطف اندوزی ہو وہ دوسروں کے ساتھ انصاف کر ہی نہیں سکتیں، اس پر ان قوموں کے حالات شاہد ہیں،

اسی لئے مختلف قوموں کے درمیان عدل و مساوات اور دنیا میں قیام امن کی کوئی تدبیر کامیاب نہیں ہو پاتی، بین الاقوامی مجالس انسانی حقوق کے چارٹر اور عدل و مساوات کے قوانین بناتی ہیں، لیکن اس کا بہت کم نتیجہ نکلتا ہے، اور خود عدل و مساوات اور قیام امن کے داعی ان قوانین کو پامال کرتے رہتے ہیں، ایک طرف قیام امن کا وعظ کہتے ہیں، دوسری طرف انسانوں کی ہلاکت و بربادی کے اسلحہ کی تیاری بھی زور شور سے جاری رہتی ہے، کمزور قومیں صرف ان کا ضمیمہ بنکر زندہ رہ سکتی ہیں،

اس وقت دنیا دو بلاکوں میں تقسیم ہے، جمہوری اور کمیونسٹ، جمہوریت نواز امریکہ میں آج تک ریڈ انڈین کو عملاً مساویانہ حقوق حاصل نہیں ہیں، ویٹ نام میں اس نے جو کچھ کیا وہ سب کے سامنے ہے، اسرائیل کو عربوں پر مسلط کر رکھا ہے، جو اس کی شہ پر علانیہ بین الاقوامی قوانین کو پامال کرتا رہتا ہے، لاکھوں عرب غریب الوطنی کی زندگی بسر کر رہے ہیں اور مذہب انسانیت کے مبلغ خاموش تماشائی بنے ہوئے ہیں، روس کا حال جو عدل و مساوات کا سب سے بڑا مبلغ ہے اس سے بھی برا ہے، جمہوری ملکوں میں کم از کم اپنے ملک والوں کو آزادی حاصل ہے، کمیونسٹ ملکوں میں یہ بھی نہیں، اس میں تو دل و دماغ تک پر پابندی ہے، اہل ملک اسکے علاوہ کچھ سوچ ہی نہیں سکتے، نیک نیتی سے بھی کمیونزم پر تنقید کی سزا قتل یا جلا وطنی ہے، دوسری قوموں کے ساتھ اسکا طرز عمل یہ ہے کہ اس نے سوویٹ یونین کی مسلم آبادیوں کے مذہب اور تہذیب کو اس طرح مٹایا ہے، کہ اس سرزمین میں جو صدیوں اسلامی علوم و فنون اور اسلامی تہذیب و ثقافت کا گہوارہ رہ چکی ہے، اور جس میں بڑے بڑے ائمہ اسلام پیدا ہوئے، چند نمائشی آثار قدیمہ کے سوا اسلام اور اسلامی تہذیب تقریباً ختم ہو چکی ہے، ان دونوں نظاموں نے پوری انسانیت کو خطرہ میں ڈال دیا ہے، ان کو تو صرف مثال کے لئے پیش کیا گیا ہے، ورنہ جس کے ہاتھ میں بھی قوت آتی ہے، اس کا یہی حال ہوتا ہے، کمزور قوموں کا معاملہ عصمت بی بی از بے چادری کا ہے،

اس کا دوسرا رخ یہ ہے کہ ایک طرف مسلک انسانیت کی دعوت ہے، دوسری طرف مغربی تہذیب کے پیدا کردہ قومیت اور وطنیت کے محدود تصور نے انسانوں میں

اتنی تفریق و تجزی پیدا کر دی ہے کہ تاریخ کے کسی دور میں اس کی مثال نہیں ملتی کوئی چھوٹے سے چھوٹا انسانی گروہ بھی دوسرے کے ساتھ مل کر زندگی بسر کرنے کے لئے تیار نہیں، جن قوموں کی نسل ایک ہے، مذہب ایک ہے، زبان ایک ہے، تہذیب ایک ہے، ان میں بھی جغرافی حد بندیوں نے اتنی تفریق پیدا کر دی ہے کہ اتحاد کے یہ سارے رشتے بیکار ہو گئے ہیں، جس کا نمونہ عرب ہیں، بڑے ملکوں میں ہر جغرافی و لسانی خطہ آزادی کا مدعی ہے اور ایک دوسرے کو غاصب سمجھتا ہے، اور وہ دن دور نہیں کہ یہ ملک چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بٹ کر آپس میں رقیب بن جائیں گے،

در حقیقت احترام انسانیت کا سب سے بڑا معلم بھی مذہب ہی ہے، ہندوستان کے سارے مذاہب کی تعلیم اہنسا ہے، جس میں انسان کیا کسی جاندار کو بھی ایذا پہنچانا جائز نہیں، بدھ دھرم کی بنیاد ہی انسان دوستی اور انسانی مساوات پر ہے، عیسائیت سراسر رحم و محبت کا مذہب ہے، اسلام کی نگاہ میں انسانوں کے درمیان کوئی تفریق نہیں، بحیثیت انسان کے سب برابر ہیں، اس نے انسانی مساوات کا یہ جامع منشور دنیا کے سامنے پیش کیا،

"تم سب کا رب ایک ہے، باپ ایک ہے، تم سب اولاد آدم ہو، جو مٹی سے بنے تھے (یعنی بحیثیت انسان کے سب برابر ہیں،) خدا کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ معزز وہ ہے جو سب سے زیادہ پاکباز ہے، کسی عربی کو عجمی پر اور کسی عجمی کو عربی پر فضیلت نہیں تم سب اولاد آدم ہو اور آدم مٹی سے بنے تھے، ساری مخلوق خدا کا کنبہ ہے، خدا کے نزدیک سب سے پسندیدہ شخص وہ ہے، جس کا سلوک اسکے کنبے کے ساتھ اچھا ہے"

"تم لوگ زمین والوں (انسان) پر رحم کرو تو آسمان والا (خدا) تم پر رحم کریگا

لہ اگرچہ اب جدید اثرات نے اہنسا کو بنیاد سے بدل دیا ہے،

جو شخص انسانوں پر رحم نہیں کرتا، خدا اس پر رحم نہیں کرتا"، کوئی مسلمان اس وقت تک صحیح معنوں میں مسلمان نہیں کہلا سکتا، جب تک وہ دوسروں کے ساتھ وہی چیز نہ پسند کرے جو اپنے لئے کرتا ہے،، کلام مجید کی آیات بلا تفریق سارے انسانوں کے ساتھ عدل و انصاف اور حسن سلوک کی تاکید سے معمور ہیں" احسن کما احسن اللہ الیک" "ان اللہ یحب المحسنین"، ان ساری تعلیمات کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپکے سچے پیرووں نے عملاً برت کر دکھایا، اور آج بھی ایک مومن کی پہچان یہی ہے، ان تعلیمات سے بڑھکر مسلک انسانیت اور کیا ہو سکتا ہے،

در حقیقت انسانوں میں وہ اخلاقی جوہر جس پر مذہب انسانیت کی بنیاد ہے، مذہب ہی پیدا کر سکتا ہے، اس کے لئے محض اخلاقیات کی زبانی تعلیم کافی نہیں فلسفہ اخلاق صرف دماغ سے اپیل کرتا ہے، اور مذہب دل سے، حدیث نبوی میں ہے کہ "انسان کے جسم میں ایک گوشت کا لوتھڑا ہے، جب وہ درست رہتا ہے، تو سارا وجود درست رہتا ہے، اور جب وہ بگڑ جاتا ہے تو سارا وجود بگڑ جاتا ہے، اور وہ قلب ہے"، اس لئے مذہب دل کو بدلتا ہے، اس کو ایک دوسرے پہلو سے دیکھئے، ایک طرف مذہب ہے جسکی تعلیم یہ ہے کہ ایک قادر مطلق دانا و بینا ذات ہے، انسان اس دنیا میں جو کچھ بھی کرتا ہے وہ سب کو جانتی اور دیکھتی ہے، اس نے نیکیوں کا حکم دیا ہے، اور برائیوں سے روکا ہے اس دنیا کے علاوہ ایک اور عالم بھی ہے، جہاں ہر شخص کو اس کے اعمال کے مطابق جزا و سزا ملے گی،

دوسری طرف یہ عقیدہ ہے کہ جو کچھ ہے، بس یہی دنیا اور اسکی لذتیں ہیں اسکے بعد کچھ نہیں، ان دونوں میں کون سا عقیدہ انسان کا تزکیہ اور اس میں اخلاقی

اوصاف پیدا کرسکتا اور اس کے ضوابط کا پابند بنا سکتا ہے، نفس کے مطالبات کی تسکین کا سامان آزادی میں ہے اسلئے انسانی فطرت اسکو اختیار کریگی یا اخلاقیات کو جس میں ہر قدم پر پابندی ہے، نفس کے تقاضوں کا دائرہ بہت وسیع ہے، اسمیں مادی تعیشات سے لیکر جاہ و اقتدار اور حکومت و سیاست سب شامل ہیں، بلکہ سب سے زیادہ لذت تو جاہ و اقتدار ہی میں ہے، اس مادی تصور میں انسانی حقوق کے تحفظ اور ان میں عدل و مساوات کی گنجائش کہاں ہے، چنانچہ آج دنیا میں جو فساد بھی برپا ہے، وہ اسی مادی نقطۂ نظر کا نتیجہ ہے،

یہ دعوی نہیں کیا جاتا کہ مذہب کے بغیر کسی انسان کی اصلاح ہو ہی نہیں سکتی، انفرادی حیثیت سے اس کی مثالیں مل جائیں گی، لیکن مذہب کے بغیر کوئی بڑا اور دیرپا اخلاقی انقلاب نہیں ہو سکتا، جن انسانوں کی فطرت سلیم ہوتی ہے، ان میں تعلیم و تربیت قبول کرنے کی قدرتی صلاحیت ہوتی ہے، ان کے لئے اخلاقی تعلیم کافی ہے، لیکن اکثریت کی فطرت سرکش اور آزاد ہوتی ہے، وہ قید و بند کو نہیں پسند کرتی، جن طبیعتوں میں فطری شر ہوتا ہے، ان کو مواخذہ کا خوف ہی قوانین کا پابند بنا سکتا ہے، اسی غرض سے دنیاوی قوانین بنائے جاتے ہیں، اگر محض درس اخلاق کافی ہوتا تو قوانین کی ضرورت ہی نہ پڑتی،

دنیاوی قوانین اور مذہب میں یہ فرق ہے کہ دنیاوی قوانین کا مقصد صرف معاشرہ میں عدل و نظم کا قیام ہے، انسانی اخلاق کا تزکیہ نہیں، اسکو اخلاقیات سے صرف اسی حد تک بحث ہوتی ہے جسکا برا اثر سوسائٹی پر نہ پڑے، چنانچہ اگر ایک شخص قانون کا پابند ہے تو پھر قانون کو اس سے بحث نہیں، کہ اسکی اخلاقی زندگی کیسی ہے، اور مذہب کا مقصد انسان کے باطن کی اصلاح ہے، اس کی نگاہ میں ہر وہ فعل جرم ہے، جو اخلاقی پاکیزگی

کے خلاف ہے، خواہ اس کا اثر اس کی ذات تک محدود ہو، دوسرے الفاظ میں قانون کا مقصد انسان کی ذہنی و نفسی کیفیت کا بدلنا نہیں بلکہ صرف اسکی ظاہری پابندی ہے اور مذہب کا مقصد اسی ذہنی و نفسی کیفیت کا پیدا کر دینا ہے، جس سے انسان کو طبعاً نیکیوں اور اچھے کاموں کی طرف رغبت اور بدی اور شر سے نفرت پیدا ہو جائے، اگر ایک شخص مذہب کے ظاہری احکام کا تو پابند ہے، لیکن باطنی اخلاق کی پاکیزگی نہیں رکھتا تو اسکو صحیح معنوں میں مذہبی نہیں کہا جا سکتا، اسی لئے سارے مذاہب نے ظاہری احکام کی پابندی کے ساتھ اور اس سے زیادہ باطنی اخلاق کی پاکیزگی پر زور دیا ہے، اور یہ چیز مذہب ہی پیدا کر سکتا ہے،

اس سے کسی کو بھی انکار نہیں کہ جدید علوم اور سائنس کی ایجادات نے انسانیت کی بڑی خدمت کی ہے، اس نے انسانی راحت و آسائش کے ایسے ایسے سامان فراہم کر دیئے ہیں جن کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا، اسکی ایجادات سے انسانیت کو بڑے فوائد پہنچے، اور آج کوئی قوم بھی سائنسی علوم کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی، مغربی قوموں میں انسانی ہمدردی کا جذبہ بھی ہے اور وہ اس کا عملی ثبوت بھی دیتی رہتی ہیں، ان میں بہت سے قابل تقلید اوصاف ہیں، لیکن مغربی تہذیب کی لادینیت اور مادی تصور حیات نے روحانی اور بہت سے اخلاقی پہلوؤں کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے، صرف مادی ترقی ہی زندگی کا نصب العین بن گئی ہے، ہر قوم اسی جنون میں مبتلا ہے، بڑی قومیں دنیا کے بڑے سے بڑے حصہ کو اپنے حلقۂ اثر میں لا کر اپنا نظریۂ حیات اس پر مسلط کرنا چاہتی ہیں، اس کے لئے ان میں مسابقت کا ایک حشر برپا ہے، اس میدان میں ہر قوم آگے نکل جانا چاہتی ہے، اس کا نتیجہ ہے کہ انسانی ذہن و دماغ کی ساری صلاحیتیں اور سائنس کی ساری قوت ایسے ہلاکت خیز اسلحہ کی ایجادات میں صرف ہو رہی ہے جس سے حریفوں کو زیر کر کے اپنی برتری

کا سکہ بٹھایا جا سکے، اس مسابقت نے دنیا کو ہلاکت کے دہانہ پر پہنچا دیا ہے،

جن چیزوں کو سائنس کا بڑا کارنامہ سمجھا جاتا ہے اور جس پر ایک دنیا جھومتی ہے، وہ بھی اسی جذبہ کا نتیجہ ہیں، فلک پیما راکٹوں کا مقصد یہ ہے کہ دشمن کا کوئی ملک اسکی زد سے باہر نہ رہے، چاند پر انسانی قدم کا پہنچنا بلاشبہ انسانی عزم و حوصلہ کی بہت بڑی فتح اور سائنس کا بہت بڑا کارنامہ ہے، لیکن وہ بھی جذبہ مسابقت سے خالی نہیں، اس سے انسانیت کو کیا فائدہ پہنچا اور اس کے درد دکھ کا کیا مداوا ہوا، جو بے گراں دولت فلک پیمائی پر صرف ہو رہی ہے، اگر پس ماندہ ملکوں اور مصیبت زدہ انسانوں پر صرف ہوتی تو انسانیت کی کتنی بڑی خدمت ہوتی، آج کتنے انسان ایسے ہیں جن کو زندگی کی بنیادی ضروریات بھی میسر نہیں، کروڑوں انسان آلام و مصائب کا شکار ہیں، اگر بڑی قوموں نے فلک الافلاک پر بھی اپنی فتحمندی کا جھنڈا گاڑ دیا اور غریب انسانیت کراہتی رہی تو اس سے کیا حاصل، اس کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اس قسم کی ایجادات و تجربات ترقی کا معیار بن گئے ہیں، اور ملک کے دفاع کے لئے ان کو ضروری سمجھا جاتا ہے، اس سے وہ قومیں بھی جن کو پیٹ بھر کھانا اور ستر پوشی کے لئے کپڑا تک میسر نہیں اس کا خواب دیکھتی ہیں،

اس مادی تصور حیات کا دوسرا تاریک پہلو یہ ہے کہ نفس پرستی کا ایک سیلاب امنڈ پڑا ہے، جس نے عفت و پاکیزگی کے تصور کو بالکل ختم کر دیا ہے اور لذت پرستی اس حد تک پہنچ گئی جہاں انسانیت اور حیوانیت میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا، اس پر مغربی ملکوں کی جنسی تحریکیں شاہد ہیں، اور اس میں انھوں نے ایسی جدتیں پیدا کی ہیں جن سے حیوانی فطرت بھی ابا کرتی ہے، اس قسم کے واقعات آئے دن اخبارات میں چھپتے رہتے ہیں، جن سے ہر شخص واقف ہے، اس قسم کے انفرادی واقعات مشرقی

ملکوں میں بھی ہوتے ہیں، لیکن انکو سوسائٹی نے ہمیشہ برا سمجھا، اور اس کے مرتکبین بھی انکو برائی ہی سمجھتے ہیں، مغربی ممالک کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے اس کو ہنر اور آرٹ بنا دیا ہے، مگر بدمستی کے اس سیلاب میں کچھ ہوش والے بھی ہیں، اور یورپ کا سنجیدہ اور صاحب فکر طبقہ اس اخلاقی انارکی سے پریشان ہے، اور اس کے خلاف آواز بلند کرتا رہتا ہے، لیکن جس تہذیب اور تصور حیات کی بنیاد ہی خالص مادیت پر ہو اسکی اصلاح محض وعظ و پند سے نہیں ہو سکتی

خشت اول چوں نہد معمار کج تا ثریا می رود دیوار کج

اس کی اصلاح مذہب، خدا اور آخرت کا خوف ہی کر سکتا ہے، دنیا جتنی بھی ترقی کر جائے، لیکن روحانیت اور اخلاقی پاکیزگی کے لئے مذہب ہی کی محتاج رہے گی، یا تو ایک دن اس کے ماننے پر مجبور ہوگی یا مادہ پرستی اس کا خاتمہ کر دیگی، یہ خوش عقیدگی نہیں بلکہ واقعہ ہے، اگر بغیر کسی اخلاقی قید کے مہلک اسلحہ کی دوڑ اسی طرح جاری ہے تو اس کا انجام دنیا کی تباہی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے،

مَعَارف سلیمان نمبر

مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے حالات و سوانح، اخلاق و شمائل، فضائل و کمالات اور ان کے علمی، دینی، قومی، ملی، اصلاحی، اور تعلیمی کارناموں اور خدمات کا ایک دلآویز مرقع، جس میں وقت کے بہت سے ارباب کمال نے مضمون لکھ کر سید صاحب کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے، یہ درحقیقت زیر ترتیب حیات سلیمان کا پیش خیمہ ہے، جو عنقریب شائع ہونے والی ہے،

مرتبہ:۔ شاہ معین الدین احمد ندوی، صفحے ۳۱۲ ۴-۳۷

ملا محمود جونپوری

از مولانا قاضی اطہر صاحب مبارکپوری اڈیٹر البلاغ بمبئی

(۲)

ولادت اور مولد و منشاء

ملا صاحب اپنے گھر کی روایت کے مطابق سلطان نورالدین جہانگیر کی سلطنت کے دوسرے سال رمضان ۱۰۱۵ھ میں پیدا ہوئے، مولانا ابوالخیر نے شیر و شکر میں تصریح کی ہے "ولادت باسعادتش در ماہ مبارک سنہ ہزار و پانزدہ واقع شد" مگر تجلی نور اور نزہۃ الخواطر میں ملا صاحب کی پیدائش ۹۹۳ھ درج ہے[1] جو صحیح نہیں ہے، ملا صاحب کی جائے پیدائش جونپور ہے، جیسا کہ انھوں نے شمس بازغہ و الفرائد کے شروع میں تحریر فرمایا ہے، اما بعد فیقول العبد الملتجی الی ربہ الصمد محمود بن محمد الفاروقی محتدا الجونفوری مولدا"[2] یہ معلوم ہو چکا ہے کہ ملا صاحب کے پردادا شیخ محمد جونپور کے قاضی تھے، اور زیادہ تر وہیں رہتے تھے، جونپور انکا قدیم آبائی وطن تھا، اور ملا صاحب کی نانہال بھی جونپور ہی میں تھی، پھر جونپور اور ولید پور بھیرا کے درمیان اسی پچاسی میل کی مسافت ایسی نہیں تھی کہ آمد و رفت میں دقت و دشواری ہو، یہ درست ہے کہ ملا صاحب کے دادا شیخ بڑے اور ان کے والد شیخ محمد اپنے وطن میں آ رہے،

[1] تجلی نور ج ۲ ص ۸۴، و نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۳۹۰، [2] الفرائد ص ۳،

مگر یہ واقعہ ہے کہ ان کی ولادت جونپور میں ہوئی، اور اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے کہ وہ ولید پور میں پیدا ہوئے، جیسا کہ ہندوستان کی قدیم درسگاہیں اور بعض دوسری کتابوں میں مذکور ہے، ملا صاحب اپنے نانا کے یہاں جونپور میں پیدا ہوئے اور وہیں ان کی نشو و نما ہوئی، ان کے والد شیخ محمد ۶ ربیع الاول ۱۰۲۷ھ میں فوت ہوئے، اس وقت ملا صاحب کی عمر بارہ سال سے بھی کم تھی، اور نانا شیخ شاہ محمد زندہ تھے، انھوں نے اپنے نواسے کو اپنی تعلیم و تربیت میں پروان چڑھایا،

تعلیم

ملا صاحب کی تعلیم کے سلسلے میں انکے صرف دو تین استادوں کے نام ملتے ہیں، ایک ان کے نانا شیخ شاہ محمد، دوسرے نانا کے بڑے والد استاذ الملک ملا محمد افضل اور تیسرے ملا شمس نور بیرونوی، ملا صاحب نے نانہال میں قرآن شریف ختم کرنے کے بعد نانا سے علوم آلیہ نحو صرف اور ادب وغیرہ کی تعلیم حاصل کی، مولانا ابوالخیر نے تصریح کی ہے کہ "بعد ختم قرآن در تحصیل علوم ادبیہ در خدمت جد مادری آغاز کرد و من بر ابو دم پدر بزرگوار شیخ شاہ محمد علوم و فنون میں یگانہ وقت اور شرافت و مکارم اخلاق میں ممتاز تھے، مولانا ابوالخیر بھی ان سے اکتساب علم و فن کرتے تھے، اور انھوں نے ان کو شیخ العصر البحر المدقق، العلامۃ المحقق کے القاب سے یاد کیا ہے، نزہۃ الخواطر میں ملا صاحب کی پیدائش جونپور میں بتائی گئی ہے، اور یہ بھی لکھا۔

ونشأ فی مھبط جدہ شاہ محمد و قرأ علیہ کتب الدرسیۃ،[1]

ملا صاحب اپنے نانا شاہ محمد کے یہاں پروان چڑھے اور ان سے کتب درسیہ کی تعلیم پائی،

[1] نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۳۹۰،

تذکرہ علمائے ہند میں بھی یہی ہے کہ ملا ابتداءً از جدِ خود مولانا شاہ محمد اخذ علوم کردہ[1] مولانا آزاد بلگرامی نے سبحۃ المرجان میں اور مولانا عبد الحئی فرنگی محلی نے شمس بازغہ کے آخر میں شیخ شاہ محمد سے ملا صاحب کے ابتدائی تلمذ کی تصریح کی ہے، مگر ان دونوں بزرگوں نے تلمذ علی جدہٖ القریب لکھا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ شیخ شاہ محمد ملا صاحب کے نانا نہیں بلکہ دادا تھے، کیونکہ اصطلاحاً جد قریب دادا کو کہتے ہیں، نانا کے لئے جد بعید یا جد فاسد یا جد الام کہا جاتا ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ ملا صاحب جونپور میں اپنے نانا کے یہاں پیدا ہوئے[2] وہیں سن شعور کو پہونچے اور عربی کی ابتدائی تعلیم ان ہی سے حاصل کی۔

استاذ الملک ملا محمد افضل جونپوری

اس کے بعد تمام تذکرہ نگاروں کی تصریح کے مطابق ملا صاحب نے اپنے نانا کے بڑے بابا استاذ الملک ملا محمد افضل سے اپنی خداداد ذہانت و فطانت اور کوشش سے قلیل مدت میں جملہ مروجہ علوم و فنون کی تحصیل و تکمیل کر لی، ملا محمد افضل کے والد مفتی حمزہ عثمانی علاقہ ماژندران سے آکر قصبہ ردولی میں آباد ہوئے[3] اور وہیں ۱۶ رمضان [illegible]ھ میں ملا محمد افضل پیدا ہوئے، سن شعور کو پہونچکر اپنے والد مفتی حمزہ سے علوم عقلیہ و نقلیہ کی تعلیم حاصل کی، پھر جونپور آئے اور یہاں سے لاہور جاکر ملا عبد الحکیم سیالکوٹی متوفی ۱۰۶۷ھ سے پڑھا، پھر دہلی میں ملا شیخ حسین کے حلقۂ درس سے استفادہ کیا، ملا شیخ حسین جملہ مروجہ علوم و فنون میں یکتائے روزگار تھے، ملا طاہر لاہوری اور حکیم اسمٰعیل سے بھی شرف تلمذ رکھتے تھے، دہلی ہی میں صحاح ستہ اور دیگر کتب حدیث ملا ابو حنیفہ سے پڑھیں، جو مخدوم الملک اور حکیم گیلانی کے شاگرد دوں

---

[1] تذکرہ علمائے ہند ص ۲۲۱، [2] ان کی نسل اب بھی ردولی میں آباد ہے، [3] ملا افضل جونپوری خواجہ خان باروتی کی اولاد تھے، اس لئے ان کی نسل کے لوگ اپنے کو باروتی لکھتے ہیں،

میں تھے، اور ان ہی کی خدمت میں رہکر مسائل کے استنباط و تحقیق میں مہارت حاصل کی، اسطرح ملا محمد افضل نے بیس سال کی عمر میں تمام مروجہ علوم و فنون کی تحصیل و تکمیل سے فراغت پائی،

اس وقت جونپور شیراز ہند بنا ہوا تھا، ہر طرف علماء و فضلاء کا مجمع تھا، ملا محمد افضل فراغت کے بعد اپنے چھوٹے بھائی شیخ سلطان محمود (ملا محمود کے نانا کے والد) کے ساتھ جونپور آئے اور محلہ سپاہ میں قیام کر کے درس و تدریس میں مشغول ہوگئے، ملا محمد افضل ظاہری علوم میں یگانۂ روزگار ہونے کے ساتھ روشن ضمیر صوفی بھی تھے، شیخ عبد القدوس قلندر شطاری نظام آبادی متوفی ۹۵۳ھ سے بیعت و نسبت رکھتے تھے، جو شیخ قدن اور قطب صدیق کے لقب سے مشہور تھے، اور میر علی عاشقاں سرائمیری متوفی ۱۰۰۵ھ اور شیخ دیوان عبد الرشید متوفی ۱۰۸۲ھ کے شیخ و مرشد تھے، انھوں نے طریقۂ شطاریہ کو براہ راست اس کے بانی شیخ عبد اللہ بن حسام الدین خراسانی سے حاصل کیا تھا، ملا محمد افضل زندگی بھر درس و تدریس میں مشغول رہے، ان کے فضل و کمال کا شہرہ دور دور تک پہونچا، علمائے جونپور نے خاص طور سے ان سے استفادہ کیا، یہ جہانگیر کا دور سلطنت تھا، جونپور کے وقائع نگار نے ملا محمد افضل کی مرجعیت اور ان کے علم و فضل کے بارے میں جہانگیر کو اطلاع دی، اس نے انکو استاذ الملک کا لقب دیا اور جونپور کے شاہی مدرسہ کی مدرسی اور جاگیر کا پروانہ روانہ کیا مگر ملا محمد افضل نے اس کے قبول کرنے سے معذرت کی اور پوری زندگی توکل و تدریس میں گذار دی، یوں تو ان کے تلامذہ میں بڑے بڑے علماء و فضلاء اور اہل اللہ تھے مگر ان میں انکو اپنے دو شاگردوں پر ناز تھا، اور ان دونوں کے بارے میں فرمایا کرتے تھے کہ علامہ تفتازانی اور علامہ جرجانی کے بعد ایک وقت اور ایک شہر میں ان کے جیسے دو

فضلاء کا اجتماع نہیں ہوا، یہ دونوں ملا محمود اور شیخ عبد الرشید تھے، ملا محمود کا انتقال استاد کی زندگی ہی میں ہوگیا ان کو انکی وفات کا اتنا صدمہ ہوا کہ اس کے اثر سے ۱۳ ربیع الثانی ۱۰۶۲ھ میں انتقال کر گئے، ان کی کوئی اولاد باقی نہیں رہی البتہ ان کے چھوٹے بھائی، سلطان محمود کی نسل چلی جو ماضی قریب تک ملا محمد افضل کے مکان اور خانقاہ واقع محلہ سپاہ میں آباد تھی[1]، ملا محمد افضل کے تذکرہ میں صاحب تجلی نور نے لکھا ہے کہ جس وقت ملک العلما قاضی شہاب الدین دولت آبادی کا وصال ہوا، اہل جونپور نے علم کا الوداعی ماتم کیا ان کو یہ معلوم نہ تھا کہ ملک العلماء خود تو دنیا سے تشریف لے گئے مگر علم کی خلعت فاخرہ استاذ الملک ملا محمد افضل کے لئے چھوڑ گئے،

گماں مبر کہ تو چوں بگذری جہاں بگذشت
ہزار شمع بکشتند و انجمن باقی است

مولانا شمس نور بردونوی جونپوری

ملا صاحب کے ایک اور استاذ مولانا شمس نور (شمس الدین ابن نور الدین) بردونوی جونپوری تھے، وہ بردونہ میں پیدا ہوئے، اور مروجہ تعلیم و تربیت سے آراستہ ہو کر مسند تدریس کو رونق بخشی اور اپنے زمانہ کے مشہور علماء میں شمار کئے گئے[2] ان کی درسگاہ سے علماء فضلاء کی ایک بڑی جماعت نکلی جس میں ان کے بھانجے دیوان محمد رشید اور ملا محمود قابل ذکر ہیں، صاحب تجلی نور نے لکھا ہے،

مولانا دیوان عبد الرشید در اوائل حال کتب متداولہ در خدمت خواندہ بود، و علامہ ملا محمود ہم سبقی آموختہ اوست'

مولانا دیوان عبد الرشید نے ابتدائی کتابیں انسے پڑھیں اور ملا محمود نے بھی ان سے درس لیا ہے،

نزہتہ الخواطر میں ہے:

[1] تذکرۃ العلماء ص ۲۴ و ۲۵ و تجلی نور ج ۱ ص ۲۳ و ۲۴ [2] نزہتہ الخواطر ج ۵ ص ۱۶۸،

قرء علیہ محمود بن محمد الجونپوری صاحب الشمس البازغۃ بعض الکتب وقرء علیہ ابن اختہ محمد رشید بن مصطفی الجونپوری صاحب الرشیدیۃ انتہی

ملا محمود نے ان سے بعض کتابیں پڑھی ہیں، اور ان کے بھانجے دیوان محمد رشید جونپوری نے بھی پڑھا ہے،

ان کے علم و فضل کی شہرت سن کر اکبر نے شاہزادہ پرویز کی تعلیم ان کے سپرد کی، انھوں نے الہ آباد جا کر یہ خدمت انجام دی، اکبر نے ان کو جونپور ---- کا قاضی بھی بنایا، بعد میں انھوں نے افتاء اور درس و تدریس کا مشغلہ اختیار کر لیا، ایک بہت بڑا مدرسہ اور ایک عظیم الشان خانقاہ تعمیر کی، اکثر فضلائے جونپور نے ان سے استفادہ کیا، ۱۰۴۷ھ میں جونپور میں انتقال فرمایا اور اپنے مدرسہ میں دفن کئے گئے، مدرسہ اور خانقاہ کا کوئی نشان اب باقی نہیں ہے، ان کی اولاد میں شاہ محمد طفیل ایک بزرگ تھے، ان کے دروازہ کے سامنے ملا شمس نور کا مزار تھا، ان کے تلامذہ میں ملا رکن الدین ہریاوی بھی ہیں[1]

زمانہ طالب علمی اور ذکاوت و ذہانت

ملا محمود میں بچپن ہی سے خداداد ذہانت و ذکاوت تھی، اور گھر ہی میں اپنے نانا اور ان کے بڑے بابا سے پوری تعلیم حاصل کی تھی، ان دونوں بزرگوں کی خصوصی توجہ کا نتیجہ یہ نکلا کہ طالب علمی کے ہی زمانہ میں ملا صاحب کو ایسی شہرت و ناموری حاصل ہوگئی کہ ان کے سامنے بڑے بڑے علماء علمی مسائل میں گفتگو کرنے میں احتیاط برتتے تھے، نزہتہ الخواطر میں ہے

کان یحضر المجالس والمحافل فی صغرہ فیتکلم و یناظر و یفحم الکبار و یاتی بما یستفید منہ اعیان البلد فی العلم

ملا صاحب بچپن میں علمی مجلسوں میں شریک ہو کر علمی مباحث میں گفتگو اور مناظرہ کرتے اور بڑے بڑے اہل علم کو خاموش کر دیتے اور

[1] تجلی نور و نزہتہ الخواطر ج ۵ ص ۱۶۸

ایسی ایسی علمی باتیں کہتے جن سے علمائے جونپور متحیر رہتے تھے، (نزہتہ الخواطر ج ۵ ص ۳۵۸)

دیوان محمد رشید عثمانی جونپوری (ولادت ۱۰۰۰ھ وفات ۱۰۸۳ھ) اور ملا محمود جونپوری (ولادت ۱۰۱۵ھ وفات ۱۰۶۲ھ) دونوں استاذ الملک محمد افضل کے عزیز ترین تلامذہ میں سے تھے، استاذ ان دونوں پر فخر کرتے تھے، اثنائے درس میں کبھی کبھی ان دونوں میں علمی نوک جھونک بھی ہو جاتی تھی، خاص طور سے حاشیہ چلپی کے درس میں ملا محمود اور دیوان محمد رشید کے درمیان مسابقت رہا کرتی تھی، تجلی نور میں ان کی طالب علمی کے تذکرہ میں ہے

چناں طبع اخاذ، وذہن رسا، حافظہ درست، چند محنت کش بود کہ بہ اندک زمانہ بر سائر طلبا، گوے سبقت ربود، ودر ہفتدہ سالگی فاتحہ انفراغ خواندہ نفادہ علمائے اشراقیین وسالارِ حکمائے مشائین گشت، [1]

ملا صاحب کی طبیعت اخاذ، ذہن تیز اور حافظہ قوی تھا، اور اس قدر محنتی تھے کہ تھوڑی مدت میں تمام طالب علموں پر سبقت لے گئے، اور سترہ سال کی عمر میں مروجہ علوم سے فارغ ہو کر اشراقی علماء اور مشائی حکماء کے سرخیل بن گئے،

ملا صاحب کے تقریباً تمام سوانح نگاروں نے سترہ سال کی عمر میں تحصیل وتکمیل سے فراغت کی تصریح کی ہے، اس حساب سے ۱۰۳۲ھ میں سلسلۂ تعلیم ختم ہوا، اور اسی سال ان کے نانا شیخ شاہ محمد کا وصال ہوا، والد کا انتقال زمانہ طالب علمی ہی میں جب ملا صاحب صرف بارہ سال کے تھے ۱۰۲۷ھ میں ہو گیا تھا، اس حادثہ کے پانچ سال

[1] تجلی نور ج ۲ ص ۴۹

بعد ملا صاحب فارغ ہوئے، اس وقت سلطان جہانگیر کا آخری دور سلطنت تھا،

ملا صاحب کے دادہال اور نانہال دونوں میں قدیم زمانہ سے ظاہری علوم کے ساتھ روحانیت اور مشیخت کا بھی ذوق تھا، ان کے جد اعلیٰ سلسلۂ سہروردیہ کی خلافت سے بہرہ ور تھے، خاندان میں سجادہ نشینی کا سلسلہ جاری تھا، ان کے دادا شیخ بڑے مخدوم ابراہیم سے بیعت تھے، اور ان کے خسر سید گھورن قاضی محمد آباد مشہور سادات میں سے تھے، اور والد شیخ محمد نے بھی سلوک ومعرفت کی راہ اختیار کر لی تھی اور آخر میں گوشہ نشین ہو گئے تھے، پرنانا شیخ المشائخ قطب الآفاق سلطان محمود شیخ مبارک حیری مالی جونپوری متوفی ۹۰۳ھ اور شیخ میر علی عاشقاں سرائمیری متوفی ۹۶۵ھ کے مرید وخلیفہ اور نانا شیخ شاہ محمد شیخ العصر والبحر المدقق والعلامۃ المحقق تھے، ملا محمد افضل علوم وفنون میں یگانہ ہونے کیساتھ روشن ضمیر صوفی اور صاحب دل بزرگ تھے، میر علی عاشقاں کے پیر ومرشد شیخ عبدالقدوس شطاری نظام آبادی متوفی ۹۶۳ھ سے بیعت کی نسبت رکھتے تھے، ایسے ماحول اور گھرانے میں ملا صاحب نے پرورش پائی اور سترہ سال کی عمر میں جبکہ ان کا عنفوان شباب تھا، مروجہ علوم وفنون خاص طور سے حکمت وادب میں یگانۂ عصر ہوئے، خاندان کے روحانی ماحول سے ان کو روحانی فیض پہونچا، ابتدا میں رسمی طور سے نہ سہی مگر طبعی طور سے روحانیت اور سلوک کا ذوق رکھتے تھے اور یہی دبی ہوئی چنگاری آگے چل کر حضرت میاں میر لاہوری کے فیض صحبت سے ایسی بھڑکی کہ ملا صاحب کی دنیا ہی بدل گئی اور انھوں نے ۱۰۵۲ھ میں شیخ نعمت اللہ فیروزپوری سے بیعت کر لی اس کی تفصیل اپنی جگہ آئے گی، بعض اقوال کے مطابق ملا صاحب حافظ قرآن بھی تھے، مگر اسکی تصریح ان کے حالات میں نہ مل سکی،

فراغت کے بعد ملا صاحب سترہ سال کی عمر میں ۱۰۳۲ء میں تحصیل علم سے فارغ ہوئے، اس کے چار سال کے بعد ۱۰۳۶ھ میں شاہجہاں کا دور سلطنت شروع ہوا، سبحۃ المرجان ص۵۳، تذکرہ علمائے ہند ص۲۲۱ اور نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۳۹۸، میں ہے کہ ملا محمود نے فراغت کے بعد مستقر خلافت آگرہ جاکر آصف خاں وزیر سے ملاقات کی، اس کے بعد جونپور واپس آکر درس و تدریس میں مشغول ہوگئے، سبحۃ المرجان اور نزہۃ الخواطر میں صبح صادق کے حوالہ سے یہ بیان نقل کیا گیا ہے، جو ملا صاحب کے ایک شاگرد کی تصنیف ہے، مگر یہ واقعہ فراغت کے فوراً بعد کا نہیں ہے کیونکہ اس کے چار سال بعد شاہجہاں کا دور سلطنت شروع ہوا، بلکہ یہ جہانگیر کا آخری دور تھا، اس لئے ملا صاحب کا جونپور سے اکبرآباد جانا، اور شاہجہاں کے وزیر آصف خاں سے ملنا ۱۰۳۶ھ کے بعد کا واقعہ ہے ملا صاحب نے یہ مدت جونپور میں درس و تدریس میں گذاری، جہاں ان کے استاذ ملا محمد افضل اور ان کے ہم سبق دیوان محمد رشید وغیرہ موجود تھے،

شاہجہاں کے دربار میں قدردانی تجلی نور میں ہے کہ ملا صاحب فراغت کے بعد جونپور ہی میں درس و تدریس میں مشغول ہوگئے، اور چند ہی دنوں میں ان کے علم و قابلیت کا شہرہ جونپور کے مدرسہ کی چہار دیواری سے نکل کر دارالخلافۃ آگرہ کے ایوان تک پہونچا، اور شاہجہاں نے ملا صاحب کو کمال آرزو اور عقیدت سے دہلی طلب کرکے فضلائے شاہی کے زمرہ میں شامل کیا، اور منصب سہ صدی ذات سے نوازا، اس سفر میں جب ملا صاحب دہلی کے قریب پہونچے تو بادشاہ کے حکم سے وزیر سعد اللہ خاں نے استقبال اور پیشوائی کی خدمت انجام دی، اور دربار میں شاہجہاں نے ملا صاحب کو اپنے پہلو میں جگہ دی، اس وقت سے ملا صاحب کی عزت و شہرت میں چار چاند

لگ گئے[1]، ملا صاحب کے شاہجہانی دربار سے متعلق ہونے کے سلسلے کی اس کڑی کو بھی پیش نظر رکھنا چاہئے کہ ان کے ہم خاندان، معاصر اور بہنوئی مولانا شاہ ابوالخیر بن شاہ ابو سعید بھیروی متوفی ۱۰۵۹ھ (مدفون بھیرا) اس سے پہلے سے شاہجہانی دربار سے منسلک ہوچکے تھے، مناقب غوثی میں ہے کہ مولانا حاجی ابوالخیر سلطان شاہجہاں کی سلطنت کے ابتدائی ایام میں دہلی گئے، ان کی علمی شہرت و صلاحیت کے پیش نظر امیرالامرا نواب شایستہ خاں نے ان کی آمد کو غنیمت جانا اور بڑے ادب و احترام سے اپنے یہاں رکھکر ان سے حدیث، تفسیر اور تصوف کی تعلیم حاصل کی شاہجہاں ان سے مل کر بہت متاثر ہوا اور شایستہ خاں کے توسط سے خواہش کی کہ وہ کوئی شاہی منصب یا جاگیر قبول کر لیں، ایک مرتبہ مولانا ابوالخیر شاہجہاں کی مصاحبت میں سیالکوٹ گئے اور شاہ میر کی خدمت میں حاضر ہوئے ۱۰۵۶ھ میں جب حج و زیارت کا ارادہ کیا تو نواب شایستہ خاں نے خدمت کرنا چاہی مگر انھوں نے قبول نہیں کیا[2]، اس لئے عجب کیا ہے کہ ملا صاحب کے شاہجہانی دربار سے منسلک ہونے میں مولانا ابوالخیر کی ذات وسیلہ بنی ہو ورنہ خود ملا صاحب بھی اس درجہ کے تھے کہ ان کے سامنے امراء و سلاطین سر عقیدت جھکائیں،

منصب سہ صدی میں بادشاہ کی طرف سے ملا صاحب کو پندرہ گھوڑے، سات ہاتھی، چار رکاب دار، گیارہ گاڑیاں اور ۵۴۰ روپئے سالانہ ملتے تھے[3]، کچھ جاگیر بھی وجہ معاش کے لئے عطا ہوئی تھی، اس کے بعد ملا صاحب جونپور کے شاہی مدرسہ میں تدریس کی خدمت انجام دینے لگے، تذکرۃ العلماء ..... میں ہے :-

---

[1] تجلی نور ج ۲ ص ۵۰۔ [2] مناقب غوثی باب ہشتم قلمی، [3] اس منصب کی تفصیل الہند فی العہد الاسلامی سے ماخوذ ہے،

بادشاہ خدمت تدریس مدرسہ سلطانی مع جاگیرات سیر حاصل بوے گذارنید مولانا در جونپور رسیدہ مشغولِ تدریس گردید[1]

بادشاہ شاہجہاں نے مدرسہ سلطانی میں تدریس کی خدمت مع اچھی خاصی جاگیر کے ملا صاحب کو پیش کی اور وہ جونپور آکر تدریس و تعلیم میں مشغول ہوگئے،

اگرچہ ملا صاحب مستقل طور سے جونپور میں رہتے تھے، مگر بوقت ضرورت شاہی دربار میں آنا جانا رہتا تھا، خاص خاص مواقع پر ان کی طلبی بھی ہوتی تھی، اور شاہجہاں کے ساتھ امرائے دربار بھی ان سے استفادہ کرتے تھے، تذکرہ العلماء..... اور دوسری کتابوں میں ہے،

سلطان نیز اکثر مسائل علمی ازوے استفادہ کرد، حسب الحکم سلطان شاہزادہ محمد شجاع نزد علامہ تلمذ نمود...... و امیر الامراء شایستہ خاں کتاب فرائد تمام گذرانید

خود سلطان شاہجہاں بھی ان سے علمی مسائل میں اکثر استفادہ کرتا تھا اور شاہی حکم سے شاہزادہ محمد شجاع نے ملا صاحب کی شاگردی کی اور امیر الامراء شایستہ خاں نے ان سے پوری الفرائد پڑھی،

ایک واقعہ کے سلسلے میں لکھا ہے کہ:۔

سعد اللہ خاں وزیر کہ تلمیذ علامہ محمود بود کوائف فہم و فراست علامہ بیان نمود[2]

وزیر سعد اللہ خاں ملا محمود کے تلمیذ تھے، اور انھوں نے بادشاہ سے ان کے علمی کمالات بیان کئے،

غرض بادشاہ اور شاہزادہ سے لے کر امراء و اعیان دولت تک نے ملا صاحب سے

---

[1] تذکرۃ العلماء ص ۴۸، [2] تذکرۃ العلماء ص ۱۴۶، ۴۷، ۴۸،

استفادہ اور ان سے شرف تلمذ حاصل کرنے میں عزت محسوس کی، ملا صاحب کی درباری زندگی سے متعلق کچھ واقعات کتابوں میں ملتے ہیں جن سے ان کے مقام و مرتبہ کا پتہ چلتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ شاہجہاں کے درباری علماء و فضلاء میں ملا صاحب ممتاز حیثیت کے مالک تھے، چند واقعات ملاحظہ ہوں،

شاہی دربار میں ملا صاحب کے مقابلہ میں ایک ایرانی فاضل کی شکست

صبح صادق کے حوالہ سے تذکرۃ العلماء نے لکھا ہے کہ شاہ ایران کی طرف سے ایک ایلچی اکچ نامی شاہجہاں کے دربار میں آیا، وہ مادرزاد اندھا تھا، اس کے بدلہ میں مگر اللہ تعالیٰ نے اس کی چشم باطن کو زبردست بصیرت بخشی تھی، عقلی و نقلی علوم و فنون کے اہم اوق مسائل اس کو ازبر تھے، اس نے ہندوستان کے علماء سے بحث و مناظرہ کی خواہش کی، چنانچہ اکبرآباد وغیرہ کے علماء بلائے گئے، مگر مجلس مناظرہ میں اکچ کے مقابلہ میں وہ ٹھہر نہ سکے، شاہجہاں کو اس کے مقابلہ میں اپنے علماء کی بے مائگی پر بڑا تعجب ہوا، اس نے ارکان دولت سے کہا کہ ہماری قلمرو میں بڑے بڑے علماء و فضلا موجود ہیں ان میں کسی ایسے عالم کو بلایا جائے جو اکچ سے مناظرہ کر سکے، وزیر سعد اللہ خاں نے جو ملا محمود کے سامنے زانوے تلمذ تہ کر چکا تھا، اور ان کی ذہانت و ذکاوت سے اچھی طرح واقف تھا، ناظم جونپور کے نام شاہی فرمان لکھا کہ علامہ کی خدمت میں خود حاضر ہو کر شاہی فرمان پیش کر کے کسی طرح ان کو دار الخلافہ آنے پر راضی کرو، چنانچہ ملا صاحب بڑے کرو فر کے ساتھ دہلی روانہ ہوئے، جب دہلی کے قریب پہونچے تو وزیر سعد اللہ خاں، آصف خاں اور دوسرے ارکان دولت نے بڑھ کر استقبال کیا، اور کمال تعظیم و توقیر کے ساتھ ان کو شاہی دربار میں پہنچایا، ... شاہجہاں کے حکم سے مجلس مناظرہ منعقد ہوئی جس میں اثبات ہیولیٰ کی بحث چھڑ گئی، اکچ نے اثبات ہیولیٰ پر بہ

باری سے وہ تمام دلائل پیش کئے جو اسے یاد تھے، ملا صاحب نے اس کی ہر دلیل کا ایسا کافی وشافی جواب دیا کہ تمام حاضرین ان کی تعریف وتحسین کرنے لگے، آخر میں ایلچی نے ملا صاحب سے کہا کہ اچھا اگر آپ کے پاس اثبات ہیولیٰ کی کوئی دلیل ہو تو بیان کیجئے، ملا صاحب نے اثبات ہیولیٰ پر اپنا ایک رسالہ الدوحۃ المیادۃ فی حدیقۃ الصورۃ والمادۃ پیش کیا، اس کے علاوہ اثبات ہیولیٰ پر چند خاص دلائل بیان کئے، ان کو سن کر ایلچی نے بے اختیار اپنی جگہ سے اٹھ کر ملا صاحب کے ہاتھوں کو بوسہ دیا اور اپنی کمر کا خنجر انکی کمر میں باندھ دیا، اور ان الفاظ میں ملا صاحب کے علم وفضل کا بھری مجلس میں اعتراف کیا،

جوانے بایں فہم و فراست از ولایت ایران تا ہندوستان کمتر یافتہ، اس فہم و فراست کے جوان عالم ایران سے لیکر ہندوستان تک بہت کم نظر آئے ہیں،

شاہجہاں نے ملا صاحب کی کامیابی پر زر وجواہر سے بھرے ہوئے طبق ان کی خدمت میں پیش کئے، کچھ دنوں کے بعد جب ایلچی ایران واپس جانے لگا تو اس نے درخواست کی کہ ملا صاحب کی تصانیف بھی شاہی تحائف میں شامل کیجائیں اور شاہ ایران کی خدمت میں یہ قیمتی تحفہ بھی بھیجا جائے،

ملا صاحب خود بھی بڑے غیور و حساس تھے اور علماء و فضلاء کی غیرت وحمیت سے واقف تھے، انھوں نے شاہجہاں سے کہا کہ یہ عالم حد درجہ غیور ہے اور معقولات میں کسی کو اپنا ہم پلہ نہیں سمجھتا، اس مناظرہ میں خفت وشکست سے غالباً زندہ نہ رہ سکے گا، ملا صاحب کا یہ اندازہ صحیح نکلا اور ایلچی واپس خلافہ اکبر آباد سے ایران جاتے ہوئے

تیسری منزل پر فوت ہو گیا،[1]

رصدگاہ بنانے کی پیش کش

ایک مرتبہ ملا صاحب نے شاہجہاں سے رصدگاہ بنانے کی خواہش ظاہر کی اور اس کے لئے ایک ایسی جگہ تجویز کی جہاں قدیم زمانہ میں کسی بادشاہ نے رصدگاہ بنوائی تھی مگر اس کے لئے کثیر رقم کی ضرورت تھی، اس لئے یہ تجویز بروئے کار نہ آسکی، وفیات الاعلام کے حوالہ سے نزہۃ الخواطر نے لکھا ہے کہ ملا صاحب نے ایک رصدگاہ بنانے کا ارادہ کیا اور اکبر آباد جاکر بادشاہ کو آمادہ کر لیا، مگر وزیر نے اس رائے سے اتفاق نہیں کیا، اور بادشاہ سے کہا کہ اس وقت بلخ کی مہم درپیش ہے جس کے لئے بہت زیادہ روپیہ کی ضرورت ہے، الغ بیگ کی رصد کے بعد اس کی ضرورت نہیں ہے،[2] مآثر الکرام میں بھی اختصار کے ساتھ یہی درج ہے،[3] تجلی نور میں ہے کہ زرکثیر کے خرچ کا خیال رصد کی تعمیر میں مانع ہوا،[4] تذکرۃ العلماء میں اس وزیر کا نام سعد اللہ خاں ہے اور یہ لکھا ہے کہ وہ ملا صاحب کی حداثت سن اور علمی تبحر سے حسد کرتا تھا، اس لئے اس نے بلخ کی مہم کا بہانہ کرکے بادشاہ کو رصد بنانے سے روک دیا،[5] ملا صاحب سے سعد اللہ خاں کا حسد کرنا بظاہر سمجھ میں نہیں آتا کیونکہ اسی کتاب میں تصریح ہے کہ سعد اللہ خاں وزیر کہ تلمیذ علامہ محمود بود، کوائف فہم و فراست علامہ بیان نمود (ص ۴۶) ایسا شاگرد اپنے استاد سے کس طرح حسد کر سکتا ہے، پھر یہ وہی ملا سعد اللہ لاہوری ہیں جس نے ملا عبد الحکیم سیالکوٹی سے علم کی تحصیل وتکمیل کی، اور مدرسۂ وزیر خاں لاہور میں درس دیا، ۱۰۵۰ھ میں جب شاہجہاں لاہور گیا اور اس کے علم وفضل کا شہرہ سنا تو خلعت شاہی سے سرفراز کیا، پھر اس کے بعد سعد اللہ خاں کا لقب دیکر وزارت کا منصب عطا کیا اور ۱۰۵۶ھ

---

[1] تذکرۃ العلماء ص ۴۵، ۴۶، [2] نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۳۹۸، [3] مآثر الکرام ج ۱ ص ۲۰۲، [4] تجلی نور ج ۲ ص ۵
[5] " " " " ص ۴۸،

میں اپنا سفیر بنا کر بلخ بھیجا، ایسے عالم و فاضل اور امیر و وزیر کا حسد کرنا بعید از قیاس معلوم ہوتا ہے،

حوض میں کتنا پانی ہے؟

ملا صاحب حکمت و فلسفہ کے جملہ اقسام میں مہارت تامہ رکھتے تھے، جن میں ریاضی، حساب، اور ہندسہ بھی شامل ہے، ایک مرتبہ دہلی میں شمسی حوض سے گذر ہوا تو اس پر ایک نظر ڈالکر ساتھیوں کو بتایا کہ اس حوض میں اتنی مقدار میں پانی ہے، یہ سن کر لوگوں کو تعجب ہوا، اور دل میں سوچا کہ اس کی آزمائش کرنی چاہیئے، تھوڑے دنوں کے بعد حوض کا کچھ پانی نکال دیا اور کسی بہانے سے ملا صاحب کو وہاں لیجاکر دریافت کیا کہ آج اس میں کتنا پانی ہے؟ ملا صاحب نے حوض پر نظر ڈالی اور فرمایا کہ اتنی مقدار میں اس کا پانی نکال دیا گیا ہے جس سے حاضرین کو سخت تعجب ہوا[1] ملا صاحب کی فنی مہارت کا یہ بہت معمولی مظاہرہ تھا ورنہ ریاضی اور ہندسہ جاننے والے کے لئے یہ معمولی بات ہے، راقم کے ماموں مولانا محمد یحییٰ رسول پوری متوفی ۱۱ر صفر ۱۳۸۰ھ فلکیات اور ریاضیات کے اچھے عالم تھے، وہ ریاضی کے رو سے درختوں اور مکانوں کی بلندی اور کنوئیں وغیرہ کی گہرائی بتایا کرتے تھے اور بادل کی چمک گرج سے بتا دیتے تھے کہ بادل کتنی اوپر ہے، حوض یا تالاب وغیرہ کے حدود اربعہ اور قطر وغیرہ کی پیمائش کرکے اس کے پانی کی مقدار بتائی جاسکتی ہے،

ملا صاحب کی حضرت میاں میر لاہوری کی خدمت میں حاضری

اگرچہ ملا صاحب کے فضل و کمال میں حکمت و فلسفہ اور ادب و عربیت کا رنگ نمایاں تھا، مگر وہ خاندانی دولت روحانیت و مشیخت میں بھی حصہ وافر رکھتے تھے، مادری اور پدری دونوں

[1] تجلی نور ج ۲ ص ۵۰،

سلسلوں میں احسان و تصوف، اسلوک و معرفت اور زہد و تقویٰ موروثی ملے، مگر ملا صاحب کو ان کے ظاہری علوم نے سجادہ و خانقاہ سے ہٹا کر مدرسہ و دربار میں پہونچا دیا تھا، مگر جب ایک صاحب دل کی نگاہ کیمیا اثر نے کام کیا تو تمام باطنی کیفیات ظہور میں آگئیں، اس کا واقعہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ شاہجہان لاہور گیا، جلو میں ملا محمود اور ملا عبد الحکیم سیالکوٹی متوفی ۱۰۶۷ھ بھی تھے، تینوں میاں میر لاہوری کی خدمت میں حاضر ہوئے مگر اقلیم فقر و استغنار کے شہنشاہ نے ان کی طرف کوئی توجہ نہیں کی اقلیم دنیا کے شہنشاہ کو اس سے بہت رنج ہوا، اور اقلیم علم کے دونوں شہنشاہوں نے عالمانہ شان میں میاں میر سے کہا، توجہ بہ علماء نہ کردن چہ معنی دارد؟ میر صاحب نے اسکا کوئی جواب نہیں دیا اور اندر سے اپنا کمبل لاکر بچھایا اس پر خود مؤدب ہو کر بیٹھے اور ان دونوں فاضلوں کو بیٹھا کر فرمایا، میں جاہل ہوں، ماشاء اللہ آپ حضرات عالم ہیں، اس شعر کا مطلب مجھے سمجھا دیں،

مبادا دل آن فرومایہ شاد — کہ از بہر دنیا دہد دیں بباد

یہ شعر سنتے ہی ملا عبد الحکیم پر گریہ کی کیفیت طاری ہوگئی اور ملا محمود اتنے متاثر ہوئے کہ اسی وقت درباری زندگی ترک کرکے جونپور آگئے، اور باقی زندگی درس و تصنیف میں بسر کی، لیکن ان کے ساتھ شاہی نوازش بدستور جاری رہی[1]

احسان و تصوف

جن دنوں ملا صاحب درباری علائق سے قطع تعلق کرکے سکون و اطمینان سے جونپور میں علمی زندگی گذار رہے تھے اور حضرت میاں میر کی تنبیہ نے ان میں یکسوئی پیدا کر دی تھی، بادشاہ کے حکم سے ملا صاحب کو شاہزادہ محمد شجاع

[1] تجلی نور ج ۲ ص ۵۰، ۵۱،

کی تعلیم کے لئے بنگال جانا پڑا، مگر یہ اللہ کی شان ہے کہ اس بار بھی دنیا کی راہ سے ملا صاحب کو زہد و تقویٰ کی دولت ملی اور وفات سے دس سال پہلے ۱۰۵۲ھ میں سرزمین بنگال میں شیخ نعمت اللہ بن عطاء اللہ فیروزپوری متوفی ۱۰۲۷ھ سے سلوک و طریقت کی تعلیم و تربیت حاصل کی، اس کے بعد ملا صاحب اپنے دونوں خانوادوں کے اصلی رنگ میں نمایاں ہوگئے اور تدریس و تصنیف کے ساتھ ذکر و شغل اور اوراد و وظائف اور عبادت و ریاضت میں بھی مشغول رہنے لگے، مآثر الکرام میں صرف شاہزادہ شجاع کی شاگردی کا ذکر اس طرح ہے،

شاہ شجاع بن صاحب قران شاہجہاں نزد علامہ تلمذ کرد، [1]

شاہ شجاع بن شاہجہاں نے علامہ محمود کی شاگردی کی،

تذکرۃ العلماء میں بھی اتنا ہی ہے،

حسب الحکم سلطان شاہجہاں محمد شجاع نزد علامہ تلمذ نمود، [2]

سلطان شاہجہاں کے حکم سے محمد شجاع نے علامہ سے تلمذ کیا،

مگر نزہۃ الخواطر میں وفیات الاعلام کے حوالہ سے محمد شجاع کے تلمذ کے ساتھ ملا صاحب کی بیعت و ارادت کی تفصیل بھی درج ہے،

ثم استقدمہ شجاع بن شاہجہان الی بنگالہ، فسار الیہ، وقرء علیہ الشجاع کتبا فی العلوم الحکمیۃ، واخذ محمود عن نعمۃ اللہ بن عطاء اللہ الفیروزپوری

شاہزادہ شجاع بن شاہجہاں نے ملا محمود کو بنگال بلایا، وہ وہاں گئے، اور شجاع نے ان سے حکمت و فلسفہ کی کتابیں پڑھیں، بنگال میں ملا صاحب نے شیخ نعمت اللہ بن شیخ عطاء اللہ

[1] مآثر الکرام ج۱ ص ۲۰۳، [2] تذکرۃ العلماء ص ۴۷،

بارض بنگالہ فبایعہ، واخذ عنہ الطریقۃ سنۃ اثنتین وخمسین والف، وانی رأیت رسالۃ لہ فی الاذکار التی اخذھا عن الشیخ المذکور،

(نزہۃ الخواطر جلد ۵ ص ۳۹۸)

فیروزپوری سے ملے، وہاں سے بیعت کرکے ۱۰۵۲ھ میں طریقت حاصل کی، اور میں نے (مصنف وفیات الاعلام) ملا صاحب کا ایک رسالہ دیکھا ہے جس میں وہ اذکار و اوراد درج ہیں جو انھوں نے شیخ نعمت اللہ سے حاصل کئے تھے،

شیخ خوب اللہ محمد یحییٰ الہ آبادی نے یہ رسالہ وفیات الاعلام میں نقل کردیا ہے، شیخ نعمت اللہ فیروزپوری ملا محمد افضل کے تلامذہ میں سلسلۂ قادریہ کے مشائخ میں سے تھے شاہزادہ محمد شجاع جس زمانہ میں اپنے والد کی طرف سے بنگال کا حاکم تھا شیخ نعمت اللہ سے بیعت ہوا، اس کے بعد ان کو عوام و خواص میں بڑا قبول ہوا، وہ نارنول میں پیدا ہوئے طلب علم میں مختلف شہروں کا چکر لگایا، فراغت کے بعد متاہل ہوکر فیروزپور میں مستقل سکونت اختیار کرلی، سیف خاں کی طرف سے فیروزپور میں ان کو جاگیر عطا ہوئی، وہ قادریہ و چشتیہ و نقشبندیہ سلسلوں کے جامع تھے، انھوں نے جہانگیری عہد میں ۱۰۲۰ھ میں تفسیر جہانگیری اور ترجمہ قرآن لکھا، ۱۰۲۷ھ میں فوت ہوئے، [1] ملا صاحب کی زندگی میں روحانی و اخلاقی انقلاب ان کی وفات سے دس سال پہلے رونما ہوا، اس کے بعد ان کی حکمت و دانش نے فراستِ مومن کا رنگ اختیار کرلیا، اور تدریس و تصنیف کے ساتھ اوراد و وظائف کا سلسلہ آخری عمر تک جاری رہا، اب ان کی نظر میں اپنے علم و فن کی متاع ہیچ معلوم ہونے لگی اور وہ اپنے تلامذہ میں "عالم باعمل اور مرد زاہد" بہ اطمینان دسر

[1] نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۴۲۳، ۴۲۴،

کا اظہار کرنے لگے، چنانچہ ملا صاحب کے شاگرد رشید ملا محمد صادق بن ملا شمس نور جونپوری متوفی ۱۰۶۴ھ نے جو بہت عابد و زاہد اور بڑے پایہ کے بزرگ تھے ایک مرتبہ اپنے یہاں استاد کی موجودگی میں خود نماز کی امامت کی، حالانکہ عام طور سے وہ امامت نہیں کرتے تھے، اور اس کی توجیہ میں کہا

در کلام حکما شبہہ ایمان می دارم بہر
این نماز خود را ضائع نہ نمودم

میرے نزدیک فلاسفہ و حکماء کے کلام میں ایمان مشتبہ ہے اس لئے میں نے اپنی نماز ضائع نہیں کی،

ملا صاحب اپنے عزیز شاگرد کی یہ بات سن کر بے انتہا خوش ہوئے اور فرمایا،

الحمد للہ از شاگرداں خود یک عالم باعمل و مرد زاہد یا ختم[1]

اللہ کا شکر ہے کہ میں نے اپنے شاگردوں میں ایک کو عالم باعمل اور عابد و زاہد پایا،

ملا صاحب کے مرشد شیخ نعمت اللہ فیروز پوری نے ان کو جو اذکار و اوراد تلقین کئے تھے ان کو انھوں نے ایک رسالہ کی شکل میں جمع کرایا ہے جو وفیات الاعلام میں ہے، ویسے ملا صاحب کی علمی زندگی میں روحانی انقلاب اسی وقت سے شروع ہو گیا تھا، جب حضرت میاں میر نے ایک شعر کے ذریعہ ان کی عنان عقل کو میدان قلب کی طرف موڑا تھا، اس واقعہ کے بعد سے ان کا رنگ ہی کچھ اور ہو گیا تھا، تجلی نور میں ہے،

و ملا محمود آنچناں از خویش ربود کہ بے ہیں
سکالش ترک چاکری نمودہ در جونپور آمد
و تا زیست مدرس مشغول ماند[2]

یہ شعر سن کر ملا محمود اپنے سے بے خبر ہو گئے کہ اسی وقت سے نوکری چھوڑ کر جونپور آئے اور آخر تک درس و تدریس میں مشغول رہے،

---

[1] تجلی نور ج ۲ ص ۱۰۰، [2] ایضاً ص ۵۱

اس درمیان میں شاہزادہ محمد شجاع کی تعلیم کے لئے بنگال کا سفر کیا، اور شاہجہاں کے ساتھ سفر لاہور میں جس منزل کی طرف رہنمائی کی گئی تھی، سفر بنگال میں اس منزل پر پہنچ گئے، اس کے بعد ملا صاحب جونپور سے نہیں نکلے، غالباً ملا محمد صادق نے شمس بازغہ میں حدوث دہری کی بحث دیکھی ہو گی جس میں ملا صاحب نے اپنے پیش رو فلاسفہ سے اختلاف کیا ہے، مگر بیعت و ارادت کے بعد عقل کی پرخار وادی سے نکل کر قلب کے مصفی میدان میں آگئے تھے،

بحث کلامی ملا صاحب کے تقریباً سب ہی سوانح نگار اس پر متفق ہیں کہ زندگی بھر ان کی زبان سے کوئی ایسی بات نہیں نکلی جس سے بعد میں رجوع کرنا پڑا ہو، ہر بات علم و تحقیق کی روشنی میں ناپ تول کر منہ سے نکالتے تھے، اس سلسلہ میں ان کا اصول تھا، کہ اگر کوئی آدمی کسی قسم کا علمی سوال کرتا اور اس وقت طبیعت حاضر ہوتی تو جواب دیتے تھے ورنہ صاف کہدیتے تھے کہ اس وقت دماغ جواب کے لئے تیار نہیں ہے اس معاملہ میں علمیت و قابلیت کی شان رکھتے تھے،[1] (باقی)

---

[1] سبحۃ المرجان ص ۵۳، ماثر الکرام ج ۲ ص ۲۰۲، تذکرۃ العلماء ص ۴۱۵، نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۴۹۸

حیات شبلی

یہ مولانا شبلی جیسے جامع کمالات اور عہد آفریں بزرگ کی محض سوانح عمری ہی نہیں ان کے عہد تک مسلمانان ہندوستان کے پچاس برس کی ہر قسم کی تحریکات اور واقعات کی بہت مرتب تاریخ بھی ہے، پہلے دیباچہ ہے اس کے بعد ایک طویل مقدمہ ہے، پھر اصل متن کتاب ہے، مقدمہ میں جن اکابر و اصحاب درس و تعلیم کا ذکر، علوم اسلامیہ کی تعلیم و خدمت و اشاعت کے سلسلہ میں آیا ہے، ان میں ایک نمایاں بزرگ ملا محمود جونپوری صاحب شمس بازغہ بھی ہیں، جو حضرت سوانح کے مردم خیز وطن اعظم گڈھ سے تعلق رکھتے ہیں، اس مضمون میں اسی یگانۂ وقت فاضل کے حالات و سوانح اور ان کے علمی کمالات پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے، (مرتبہ سید سلیمان ندوی)

قیمت عہ/

فن توشیح

از جناب ڈاکٹر غلام مصطفیٰ صاحب ریڈر شعبۂ عربی مسلم یونیورسٹی علی گڈھ

(۲)

اجزائے ترکیبی اس میں شک نہیں کہ موشح کا غنا و موسیقی سے بہت گہرا تعلق ہے، لیکن لحن و موسیقیت کا ادراک ہر شخص نہیں کرسکتا، موشح کی جو خوبی عام طور پر جاذب توجہ ہے وہ اس کی ترکیب اور ہیئت سے متعلق ہے جیسا کہ اس سے قبل ذکر کیا جاچکا ہے، ابتدا میں مورخین نے موشحات کی تدوین کی طرف توجہ نہیں کی، بعد کے کچھ تذکرہ نویسوں نے توجہ کی بھی تو صرف اس قدر کہ موشح نگار کا تذکرہ کرکے اس کے چند موشحات نقل کردیے جہاں تک موشح کی تعریف، اس کی ہیئت ترکیبی کی تشریح اور اس کے مختلف اجزاء کے لئے وضع اصطلاحات وغیرہ کا تعلق ہے اس کی طرف اب تک کی تحقیقات کے مطابق سب سے پہلے ابن سناء الملک مصری (م: ۱۲۱۱ء) نے قدم اٹھایا،[1] وہ خود کہتا ہے کہ عنفوان شباب ہی سے اس کو موشح سے بڑی دلچسپی تھی، چنانچہ اس نے بہت سے موشحات حفظ کر ڈالے اور عرصہ تک وہ اس فن کے نکات پر غور کرتا رہا، پھر جب اس نے دیکھا کہ کسی نے ایسی کوئی کتاب نہیں لکھی جس میں اس کے نظم کرنے کا طریقہ بیان کیا گیا ہو تو اس نے

[1] البستانی: دائرۃ المعارف، بیروت، ۱۹۶۰ء، ج: ۳، ص: ۲۰۳، ۲۰۴،

خود اندلسی موشحات سے ایسے عام اور بنیادی اصول مستنبط کئے جن کی پابندی کا ہر اس شخص کے لئے ضروری ہے جو اس میدان میں قدم رکھنا چاہتا ہے، اس کے بعد اس موضوع پر اس نے اپنی مشہور کتاب "دار الطراز فی عمل الموشحات" تالیف کی جس کے مقدمہ میں موشح کے نظم کرنے کا طریقہ اور اس کے اصول وغیرہ بیان کئے ہیں اور اس کی مثال کے لئے موشحات نقل کئے، اس کے بعد ابن خلدون (م: ۸۰۶ھ) نے اپنے مقدمہ میں موشح پر ایک فصل لکھی،[2] پھر ابشیہی (م: ۸۵۰ھ) نے بھی اپنی کتاب "المستطرف" میں ایک علیحدہ فصل اس کے لئے وقف کی،[3] اسطرح یہ سلسلہ چل پڑا۔

لیکن متقدمین کی تشریحات کچھ مبہم اور گنجلک ہیں، اسماء و مصطلحات بھی مختلف مصنفین کے یہاں مختلف ملتے ہیں، متاخرین کی کتابوں میں رفتہ رفتہ یکسانیت اور وضاحت آتی گئی ہے، اس سلسلے میں راقم الحروف کے نزدیک ڈاکٹر مصطفیٰ عوض الکریم کا بیان زیادہ معقول اور واضح ہے،[4] اس مضمون میں اسی کا تتبع کیا گیا ہے۔

موشح کی ہیئت کو سمجھنے کے لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے ایک موشحہ پورا نقل کردیا جائے پھر اس کے مختلف اجزا کی تشریح کی جائے، ذیل میں ابن زہر کا ایک مختصر اور سادہ موشحہ درج کیا جاتا ہے جس کے اجزا میں کچھ زیادہ پیچیدگی اور تنوع نہیں ہے۔[5]

[2] مقدمہ کی آخری فصل، ص: ۵۸۷، ۶۰۰،

[3] المستطرف، مصر ۱۳۹۲ھ، ج: ۲، ص: ۲۵۸ ومابعد [4] فن التوشیح، ص: ۱۹ ومابعد

[5] صلاح الدین الصفدی: الوافی بالوفیات، دمشق ۱۹۵۳ء، ج: ۱، ص: ۱، ۲، ۴۲،

مطلع — شمس قارنت بدرا — راح وندیم

(غصن) (غصن)

بیت ۱ — دور
- سمط : أدِر أكؤس الخمرِ
- سمط : عنبرية النشرِ
- سمط : إنّ الروض ذو بِشرِ

قفل : وقد درّع النهرا — هبوب النسيم

(غصن) (غصن)

بیت ۲ — دور
- سمط : وسلّت على الأفقِ
- سمط : يد الغرب والشرقِ
- سمط : سيوفا من البرقِ

قفل : وقد أضحك الزهرا — بكاء الغيوم

(غصن) (غصن)

بیت ۳ — دور
- سمط : ألا إنّ لي مولى
- سمط : تحكّم واستولى
- سمط : أما إنّه لولا

قفل : دمع يفضح السرّا — لكنت كتوم

(غصن) (غصن)

بیت ۴ — دور
- سمط : أنّى لي كتمان
- سمط : ودمعي طوفان

- سمط : شبّت فيه نيران

قفل : فمن أبصر الجمرا — في اللّجّ يعوم

(غصن) (غصن)

بیت ۵ — دور
- سمط : إذا لامني فيه
- سمط : من رأى تجنّيه
- سمط : شدوت أغنّيه

خرجہ : لعلّ له عذرا — وأنت تلوم

(غصن) (غصن)

مطلع — ایک آفتاب ایک بدر کا مصاحب ہے۔ شراب اور ندیم۔

بیت ۱ — شراب کے پیالوں کا دور چلا، جو عنبری خوشبو سے معطر ہے، باغ پُر رونق ہے، خرام نسیم نے نہر کو زرہ پہنا دی ہے۔

بیت ۲ — شرق و غرب کے ہاتھ نے افق پر بجلی کی تلوار کھینچ لی ہے اور گریۂ ابر نے پھولوں کو ہنسا دیا ہے۔

بیت ۳ — سنو! میرا ایک دوست ہے جو مجھ پر حاکم اور غالب ہے۔ سنو! اگر وہ آنسو نہ ہوتے جو راز کو نمایاں کر دیتے ہیں تو میں ضرور راز کو چھپانے والا ہوتا۔

بیت ۴ — میرے لئے کتمان راز کیسے ممکن ہے۔ جبکہ میرے آنسو سیلاب کی طرح جاری ہیں جس میں آگ بھڑک رہی ہے، پس کس نے ایسی چنگاری دیکھی ہے جو گرداب میں تیر رہی ہو۔

بیت ۵ — جب اس بارے میں مجھے اس شخص نے ملامت کی جس نے ناکردہ گناہ کا

الزام لگایا، تو میں نے اسے گا کر یہ سنایا" ہو سکتا ہے کہ اس کے لئے کوئی عذر ہو
اور تو اسے ملامت کر رہا ہے"۔

اس موشحہ پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہوگا کہ یہ ایک مطلع اور پانچ ابیات
پر مشتمل ہے، بیت کو اردو محاورہ میں بند کہہ سکتے ہیں، ہر بیت کے دو حصے ہیں، پہلا حصہ
دور اور دوسرا قفل ہے، پھر ہر دور تین اجزا سے مرکب ہے اور اس کے ہر جزء کو سمط
یعنی لڑی کہتے ہیں، اسی طرح ہر قفل میں دو جزء ہیں اور اس کے ہر جزء کو غصن یعنی شاخ
کہا جاتا ہے اور آخری قفل کو خرجہ کہتے ہیں، جس طرح پہلا قفل مطلع کہلاتا ہے،

عام طور پر ہر موشحہ کی یہی ہیئت ہوتی ہے اور اس کے اجزا کو اسی طرح تقسیم
کیا جا سکتا ہے، البتہ اجزا کی تعداد و ترکیب اور قوافی کی ترتیب مختلف ہو سکتی ہے
جس کی وجہ سے موشح کی بہت سی صورتیں بن جاتی ہیں۔

مطلع موشح کے مطلع کو مذہب بھی کہا جاتا ہے، لیکن ہر موشح میں مطلع کا ہونا ضروری
نہیں، اگر مطلع ہوگا تو اسے موشح تام کہا جائے گا اور اگر مطلع نہ ہو بلکہ موشح کی ابتدا
دور سے ہو رہی ہو تو اسے موشح اقرع کہیں گے، اس سے معلوم ہوا کہ مطلع موشح
کا لازمی جزء نہیں ہے جبکہ دور، قفل اور خرجہ اس کے لازمی عناصر ہیں۔

قفل۔ ہر بیت قفل پر ختم ہوتی ہے اور ابیات کی کوئی تعداد معین نہیں ہے، اکثر
اندلسی موشحات میں پانچ ابیات پائے جاتے ہیں اور بعض میں ابیات کی تعداد
دس اور گیارہ تک بھی ملتی ہے بہر حال اس کی کوئی حد نہیں ہے، لیکن جتنے ابیات
ہونگے اتنے ہی اقفال بھی ہوں گے اور مطلع میں جتنے اجزا و قوافی ہوں گے وہی سب
اسی ترتیب کے ساتھ اقفال میں بھی آئیں گے، کیونکہ مطلع خود بھی ہیئت کے لحاظ سے

ایک قفل ہی ہوتا ہے،

خرجہ موشح کا آخری قفل خرجہ کہلاتا ہے، اسی لئے ہیئت میں یہ پوری طرح مطلع
اور اقفال ہی کے مشابہ ہوتا ہے، لیکن موشح کے اندر سب سے زیادہ اہمیت خرجہ ہی
کی ہوتی ہے، ابن سناء الملک نے اس کی تعریف اس طرح کی ہے کہ موشح میں خرجہ
ایسا ہی ہے جیسے کھانے میں مسالہ، نمک، شکر، مشک اور عنبر[۱]۔ ابن بسام کے نزدیک
خرجہ کو موشح کے اندر مرکزی حیثیت حاصل ہوتی ہے[۲] موشح در حقیقت اپنے
خاتمہ یعنی خرجہ سے شروع ہوتا ہے، وشاح سب سے پہلے خرجہ ہی تلاش کرتا ہے
پھر اسی کو مرکز بنا کر موشح تیار کرتا ہے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ جس طرح اردو
رباعی میں عام طور پر سب سے پہلے چوتھا مصرعہ شاعر کے ذہن میں آتا ہے پھر اسی کی
مناسبت سے وہ اس سے پہلے تین مصرعے اور لگا کر ایک رباعی تیار کر لیتا ہے،
اسی طرح موشح نگار سب سے پہلے خرجہ کا انتخاب کرتا ہے پھر اسی پر ادوار و اقفال
کی تضمین کر کے موشح کی تکمیل کرتا ہے، چنانچہ ایسے موشحات بھی ملتے ہیں جن میں
کسی مشہور شاعر کے کسی شعر کو خرجہ کے طور پر استعمال کیا گیا ہے، اس سے معلوم ہوتا
ہے کہ وشاح نے پہلے اس شعر کو منتخب کیا، اس کے بعد اسی پر ادوار و اقفال کی
تضمین کر کے موشح مرتب کیا، اسی لئے اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ اندلسی موشحات
در حقیقت چھوٹے چھوٹے مشہور عوامی گیت تھے جن کو لے کر موشح نگاروں نے
اپنے موشحات تیار کئے ہیں۔

خرجہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں عوامی زبان کا استعمال صرف جائز

---

[۱] فن التوشیح، ص: ۱۲۲، [۲] الذخیرہ، قسم اول، ج: ۲، ص: ۱

ہی نہیں بلکہ مستحسن ہے، عام طور پر خرجہ غیر معرب عجمی یا عوامی ہوتا ہے، ابن سناءالملک کے نزدیک خرجہ کے لئے غیر معرب ہونا ضروری ہے، البتہ اگر موشحہ مدحیہ ہو اور اس میں ممدوح کا نام بھی آرہا ہو تو خرجہ معرب ہو سکتا ہے۔

خرجہ کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس سے عام طور پر مقولہ کی حیثیت سے لایا جاتا ہے، موشح نگار خود اپنی زبان سے اسے کہتا ہے یا کسی لڑکے، عورت، میخوار، رقاصہ، جانور یا پرندہ وغیرہ کی زبان سے کہلواتا ہے۔ اسی لئے خرجہ سے پہلے اکثر اس قسم کے الفاظ ہوتے ہیں جیسے قلت (میں نے کہا)، قال (اس نے کہا) تغنیٰ (وہ گاتا ہے) اور أنشد (میں گاتا ہوں) وغیرہ۔ اس سے سامعین کو معلوم ہو جاتا تھا کہ موشحہ اب ختم ہونے جا رہا ہے لہٰذا وہ پوری طرح متوجہ ہو جاتے تھے۔ یوں بھی سامعین شروع ہی سے بڑے شوق سے خرجہ کے انتظار میں رہتے تھے۔ غصن مطلع، قفل اور خرجہ تینوں اجزاء قوافی اور ان کی تعداد و ترتیب کے لحاظ سے یکساں ہوتے ہیں۔ ان ہی کے اجزا کو اغصان کہا جاتا ہے، ان کی کوئی تعداد مقرر نہیں ہے، کم سے کم دو غصن ضروری ہیں، اکثر موشحات میں چار اغصان پائے جاتے ہیں اور بعض میں دس اور گیارہ تک ملتے ہیں، اس کے علاوہ تمام اغصان باہم مساوی اور غیر مساوی دونوں قسم کے ہو سکتے ہیں، پھر ان کی ترتیب میں بھی بڑی وسعت ہے، چھوٹا غصن کبھی شروع میں، کبھی درمیان میں اور کبھی آخر میں ہوتا ہے۔
اسی طرح قوافی کی ترتیب میں بھی وشاح کو پورا اختیار ہوتا ہے جس طرح چاہے انکو مرتب کرلے، خواہ تمام اغصان کو قافیہ میں متحد رکھے یا مختلف، پس اغصان کی تعداد مساوی و غیر مساوی اغصان کی ترتیب اور قوافی کے اتحاد و اختلاف کو سامنے

رکھ کر حساب لگایا جائے تو اس کی صورتیں بکثرت نکلتی ہیں، مثال کے طور پر چند صورتیں درج کی جا رہی ہیں:۔

(۱) لسان الدین بن الخطیب کا ایک موشحہ جس میں دو غصن ہیں اور دونوں ہم وزن اور ہم قافیہ ہیں:۔[1]

مطلع: ربّ لیل ظفرت بالبدرِ ۔ ونجوم السماء لم تدرِ
قفل: ہبرا لیت نهر النهار لم یجرِ ۔ حکم الله لی علی الفجرِ

(میں اکثر راتوں میں ماہ کامل تک پہنچ گیا اور آسمان کے تاروں کو اسکی خبر تک نہ ہوئی۔ کاش دن کی نہر نہ بہتی اور فجر کے خلاف اللہ میرے حق میں فیصلہ فرما دیتا۔)

(۲) ابن زہر کا دو غصنی موشحہ جس میں دونوں غصن ہم وزن لیکن مختلف القافیہ ہیں:۔[2]

مطلع: سلّم الامر للقضا ۔ فهو للنفس انفع
قفل: کلّ ما فات وانقضیٰ ۔ لیس بالحزن یرجع

(معاملہ قضائے الٰہی کے سپرد کر دے کیونکہ نفس کے لئے یہی زیادہ مفید ہے، جو چیز بھی فوت ہو گئی اور گذر چکی وہ حزن و ملال سے واپس نہیں آسکتی۔)

(۳) ابن سہل کا سہ غصنی موشحہ جس میں درمیانی غصن چھوٹا ہے لیکن تمام اغصان متحد القافیہ ہیں:۔[3]

---

[1] نفح الطیب، ج:۹، ص: ۲۷۵، [2] ایضاً، ج:۳، ص: ۱۹
[3] ابن تغری بردی: المنهل الصافی، قاهرہ، ۱۹۵۶ء، ج:۱، ص: ۵۵،

مطلع ۔ باکر الی اللذّۃ والاصطباح ۔ بشرب راح ۔ فما علی اهل الهوی من جناح

قفل نمبر۱ ورد ونسرین ونرهر الاقاح ۔ کالمسک فاح ۔ والطیر تشدو بانغام النواح

(علی الصباح مے نوشی اور لطف اندوزی کی طرف سبقت کر کیونکہ اہل محبت پر کوئی گناہ نہیں ہے ، گلاب ، نسرین اور اقحوان (گل بابونہ) کے پھولوں کی خوشبو مشک کی طرح اڑ رہی ہے اور پرندے مختلف آوازوں میں گا رہے ہیں ۔)

(۴) عبادۃ بن ماء السماء کا موشحہ جو چار ہم قافیہ اغصان سے مرکب ہے مگر پہلے اور تیسرے غصن چھوٹے ہیں ؛[1]

مطلع ۔ من ولی ۔ فی امۃ امرا ولم یعدل ۔ یعزل ۔ الا لحاظ الرشاء الاکحل

قفل نمبر۱ علّل ۔ قلبی بذاک البارد السلسل ۔ ینجلی ۔ ما بفؤادی من جوی مشتعل

(جو کسی قوم کے امر کا والی ہوتا ہے اور عدل نہیں کرتا تو اسے معزول کر دیا جاتا ہے مگر سرمگیں آنکھوں والے ہرن کی نگاہیں اس سے مستثنیٰ ہیں ۔

میرے دل کو اس لطیف و خنک شراب سے بہلا دے ، جو بھڑکتی ہوئی سوزش دل میں ہے وہ دور ہو جائے گی ۔)

(۵) ابن اللبانہ کا چار غصن والا موشحہ جس میں پہلے دونوں غصن ایک قافیہ میں اور آخری دونوں غصن دوسرے قافیہ میں ہیں ؛[2]

مطلع ۔ کذا یقتاد ۔ سنا الکوکب الوقاد ۔ الی الجلاس مشعشعۃ الاکواس

قفل نمبر۱ غزال صاد ضراغمۃ الآساد ۔ بلحظ جاس ۔ خلال دیار الناس

[1] فوات الوفیات ، ج ۱ ، ص : ۴۲۶ ، [2] فن التوشیح ، ص : ۱۲۹ ،

(روشن ستارہ کی چمک لبریز پیالوں کو اسی طرح ہم نشینوں تک پہنچا دیتی ہے ۔
ایک ہرن نے لوگوں کے گھروں کے درمیان چھپنے والی نظر سے بڑے بڑے شیروں کا شکار کر لیا ۔)

(۶) ابن سناء الملک کا ایک موشحہ جو چھ اغصان پر مشتمل ہے ، پہلے دونوں غصن ایک قافیہ میں ، پھر تیسرے اور چھٹے دوسرے قافیہ میں اور چوتھے اور پانچویں غصن تیسرے قافیہ میں ہیں ؛[1]

مطلع ۔ لی فاتن ناتک ۔ بحسنہ هاتک ۔ ستر الحلی ۔

فکیف بالهائم ۔ بالله یا لائم لا تعذل

قفل نمبر۱ وانما ذالک ۔ بیا تدباتک ۔ للأجل ۔

من ناظر عادم ۔ یسل کالصارم ۔ من کحل

(میرا قاتل ایک دلیر فتنہ خو ہے جو اپنے حسن و جمال سے فارغ البال شخص کی بھی پردہ دری کرنے والا ہے ، تو پھر عاشق سرگشتہ کا کیا حال ہوگا خدا کے واسطے اے ملامت گر تو اسے ملامت نہ کر ۔ اور یہ (میرا قاتل) ایک شوخ نگاہ کی تلوار سے ہوا جو موت کی قاطع ہے اور سرمگیں آنکھوں سے شمشیر براں کی طرح کھینچی جاتی ہے ۔)

(۷) ابو بکر الابیض کا موشحہ جو آٹھ اغصان سے مرکب ہے ، پہلے تینوں غصن کا ایک قافیہ ہے ، پھر چوتھے اور آٹھویں غصن دوسرے قافیہ میں اور باقی تین تیسرے قافیہ میں ہیں ؛[2]

[1] فن التوشیح ، ص : ۲۲ ،

[2] ایضاً ، ص : ۱۳۲ ، ۱۳۳ ،

قفل[۱]: أوفى الاصيل۔ ضحى يقول۔ ما للشمول۔ لطمت خدى
وللشمال۔ هبت فمال۔ غصن اعتدال۔ ضمه بردى

قفل[۲]: بزدغليل۔ صب عليل۔ لا يستحيل۔ فيه عن عهدى
ولا يزال۔ فى كل حال۔ يرجو الوصال۔ وهو فى الصد

(یا جب شام کو مخمور ہو کر وہ لچکتے ہوئے چلتا ہے تو کہتا ہے کہ شراب کو کیا ہو گیا ہے کہ اس نے میرے رخسارہ کو سرخ کر دیا ہے، یا بادِ شمالی کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ چلتی ہے تو وہ معتدل شاخ لچک جاتی ہے جس کو میری چادر لپیٹے ہوئے ہو۔ اس عاشق بیمار کی پیاس کو بجھا دے جو کبھی عہد سے پلٹ نہیں سکتا اور ہر حال میں وصل کی امید رکھتا ہے حالانکہ وہ ہجر زدہ ہے۔)

دور و سمط | ہر قفل سے پہلے ایک دور ہوتا ہے جس میں چند اجزا ہوتے ہیں، ان کو سموط (جمع سمط: لڑی) کہا جاتا ہے۔ ایک دور میں سموط کی تعداد کم سے کم تین ہوتی ہے اور چار یا پانچ بھی ہو سکتی ہے، اس سے زائد عام طور پر نہیں ہوتی۔ یہ سموط قافیہ میں مطلع قفل اور خرجہ سے مختلف ہوتے ہیں اور کبھی کبھی ان کا وزن بھی ان سے مختلف ہوتا ہے، ایک دور کے تمام سموط ہم قافیہ ہوتے ہیں لیکن ہر دور میں نیا قافیہ استعمال کیا جاتا ہے، اور تمام ادوار کے سارے سموط ایک ہی وزن پر ہوتے ہیں، اسکے علاوہ سمط مفرد بھی ہوتا ہے اور مرکب بھی۔ مرکب ہونے کی صورت میں اس کے اندر دو یا تین یا چار فقرے ہو سکتے ہیں، اس سے زائد شاذ و نادر ہی ہوتے ہیں، پھر یہ فقرے مساوی اور غیر مساوی دونوں قسم کے ہو سکتے ہیں، اور ان کی ترتیب بھی مختلف ہو سکتی ہے، مزید برآں ان فقروں کے قوافی متحد بھی ہو سکتے ہیں اور مختلف بھی، لیکن ایک سمط

کے فقروں میں قوافی کی جو ترتیب ہو گی وہی تمام ادوار کے سارے سموط میں لازمی ہو گی اس طرح ان تمام باتوں کی بنیاد پر اگر دور کی تقسیم کی جائے تو بہت کثیر تعداد میں اس کی صورتیں نکلتی ہیں، چند صورتیں مثال کے طور پر پیش کی جا رہی ہیں:۔

(۱) ابن زہر کے موشحہ کا ایک دور جو تین مفرد سمطوں پر مشتمل ہے[۱]:۔

من لى به بدر انجلى فى الظلام
علقت من وجناته بدر التمام
وعلقت من أعطافه لدن القوام

(کون میری مدد کریگا اس بدر کے بارے میں جو تاریکی میں جلوہ افروز ہے میں اس کے رخساروں کے ماہ کامل کا دلدادہ اور اس کے نرم و نازک پہلوؤں کی لچک پر فریفتہ ہوں۔)

(۲) ابن اللبانہ کے موشحہ کا ایک دور جس میں چار سمط ہیں اور ہر سمط دو مساوی فقروں سے مرکب ہے[۲]:۔

كواعب أتراب۔ تشابهت قدا
عضت على العناب۔ بالبرد الاندى
اوصت بى الاوصاب۔ وأغرت الوجدا
واكثر الاحباب۔ اعدى من الاعدا

(چند نوجوان ہمسن لڑکیاں ہیں جو قد و قامت میں باہم مشابہ ہیں، وہ تر و تازہ اولے جیسے دانتوں سے عناب جیسے لبوں کو کاٹتی ہیں، انھوں نے

---

[۱] المغرب ج: ۱، ص: ۲۶۹، [۲] فوات الوفیات، ج: ۲، ص: ۵۱۵،

میری بیماریوں کا حکم دیا ہے اور میرے جذبۂ شوق کو بھڑکا دیا ہے اور اکثر احباب دشمنوں سے بھی زیادہ ظالم ہوتے ہیں۔)

(۳) عبادۃ بن ماء السماء کے موشحہ کا ایک دور جس کا ہر سمط دو غیر مساوی فقروں سے مرکب ہے اور چھوٹا فقرہ شروع میں ہے:[1]

انما۔ یلدز کی یوقد ناس الفتن

صنما۔ مصورا من کل شئی حسن

ان رمی۔ لم یخط من دون القلوب الجنن

(وہ صرف اس لئے باہر نکلتا ہے تاکہ فتنوں کی آگ بھڑکائے، ایک ایسے صنم کی طرح جس کی تصویر ہر چیز سے بہتر بنائی گئی ہے، اگر وہ تیر چلائے تو ڈھالوں کی وجہ سے وہ دلوں تک پہنچنے میں خطا نہ کرے۔)

(۴) ابن بقی کے موشحہ کا ایک دور جس کے ہر سمط کا پہلا فقرہ بڑا اور دوسرا چھوٹا ہے:[2]

بأرض غرناطۃ بدر۔ قد اکتملا

یطیعہ النظم والنثر۔ اذا ارتجلا

ولعض حلیتہ الفخر۔ وأی حلی

(سرزمین غرناطہ میں ایک بدر ہے جو کامل ہو گیا ہے، نظم اور نثر دونوں اس کے مطیع ہوتے ہیں جب فی البدیہہ کہے جائیں اور اس کا ایک زیور فخر ہے اور وہ کیسا عمدہ زیور ہے۔)

(۵) ابن سناء الملک کے موشحہ کا ایک دور جس کا ہر سمط تین فقروں سے مرکب ہے:

---

[1] الوافی بالوفیات، ج: ۳، ص: ۱۸۹-۱۹۰، [2] فن التوشیح، ص: ۱۸۷،

پہلے دونوں فقرے باہم مساوی ہیں لیکن تیسرا فقرہ چھوٹا ہے:[1]

ایاک عن لومی۔ رضیت بالوجد۔ مع الضنیٰ

واعتضت عن نومی۔ وراحتی سهدی۔ مع العنا

فقلت یا قومی۔ لا بظبا الهند۔ ولا القنا

(میری ملامت سے پرہیز کر، میں لاغری کے باوجود غم عشق پر راضی ہوں اور میں نے اپنی نیند اور راحت کے بدلے میں بیداری کو اختیار کر لیا ہے۔ اے میری قوم! مجھے نہ ہند کی تلواروں سے قتل کیا گیا ہے اور نہ نیزوں سے۔)

(۶) ابن القزاز کے موشحہ کا ایک دور جس کے ہر سمط میں چار فقرے ہیں:[2]

بدر تم۔ شمس ضحی۔ غصن نقا۔ مسک شم

ما أتم۔ ما أوضحا۔ ما أورقا۔ ما أنم

لا جرم۔ من لمحا۔ قد عشقا۔ قد حرم

(پورا ماہتاب ہے، چاشت کا آفتاب ہے، ٹیلے پر ایک شاخ ہے، خوشبودار مسک ہے۔ کس قدر کامل ہے، کس قدر روشن ہے، کس قدر شاداب ہے، کس قدر معطر ہے۔ لامحالہ جس نے دیکھا عاشق ہو گیا محروم ہوا۔)

آخر میں ابن القزاز کا ایک مدحیہ موشحہ مکمل پیش کیا جا رہا ہے تاکہ موشح کی پوری ہیئت ایک نظر میں سامنے آجائے۔ اس میں چھ اغصان ہیں اور ہر دور تین مرکب سمطوں پر مشتمل ہے، قوافی کی ترتیب بھی بڑی دلچسپ اور نظر افروز ہے:[3]

---

[1] فن التوشیح ص: ۲۲۱، [2] مقدمہ ابن خلدون، ص: ۵۸۸، [3] فن التوشیح، ص: ۱۷۷،

دعی أشام - برقاً جد - مرجان - قد انتظم - فیه البرد - فانہ دان

(مجھے اس بجلی کو دیکھنے دو جس میں موتیاں جمی ہوئی ہیں، اس میں اولے پروئے ہوئے ہیں پس وہ مزین و آراستہ ہے۔)

یوم النوی - فی موقف البینِ

اهدی الهوی - إلیّ ضدّین

نار الجوی - وادمع العین

تنضطرم - وتستقد - انسجان - وتنسجم - وتطرد - اجفان

(فراق کے دن جدائی کے موقع پر محبت نے دو متضاد چیزیں مجھے تحفہ میں دیں، آتش غم اور اشک چشم، پس غم مشتعل ہے اور بھڑک رہا ہے اور آنکھیں جاری ہیں اور بہ رہی ہیں۔)

قل للعدی - قد سل سیفیه

دین الهدی - من عزم ملکیه

واکدا - ودّ محبیه

شدّ نظم - حل عقد - بنیان - لا ینهدم - له الأبد - أرکان

(دشمنوں سے کہہ دو کہ دین ہدایت نے اپنے دونوں بادشاہوں کے عزم سے اپنی دونوں تلواریں کھینچ لی ہیں اور اپنے دونوں دوستوں کی دوستی کو مضبوط کر دیا ہے۔ افتراق اب اتحاد میں بدل گیا ہے اور رسی میں گرہ لگا دی گئی ہے، اسطرح ایک مستحکم عمارت قائم ہوگئی ہے جس کے ارکان کبھی منہدم نہ ہوں گے۔)

والی ابو - یحیی أبا القاسم

فالمشرب - قد لذ للحائم

والمذهب - قد ضاق بالظالم

بحرانعم - لمن ورد - ظمآن - سیفانقم - لمن مرد - أوخان

(ابو یحیی نے ابو القاسم سے دوستی کر لی ہے، پس چشمہ پیاسے کے لئے لذیذ اور راستہ ظالم پر تنگ ہوگیا ہے، وہ نعمتوں کے دو سمندر ہیں اس کے لئے جو پیاسا وارد ہو اور سزا و انتقام کی دو تلواریں ہیں اس کے لئے جو سرکشی یا خیانت کرے۔)

هل أثلا - سواهما المجدا

او شرّ بلا - حاشاهما الحمدا

بل سرا علا - لم یلبسا سعدا

جاز الحکم - أبیت خلد - لقمان - إلی همم - جازت أعلی - کیوان

(کیا ان دونوں کے سوا کسی اور نے بھی مجد و شرف کی بنیاد رکھی ہے یا ان کے علاوہ کسی اور کو بھی مدح و ستایش کی قمیص پہنائی گئی ہو۔ یہ علو شرف کے دو ماہتاب ہیں جن سے کوئی سعد فوت نہیں ہوا۔ یہ دونوں ایسی حکمتوں کے جامع ہیں جنھوں نے لقمان کے قلب و ذہن کو بھی عاجز کر دیا ہے اور ایسے عزائم تک پہنچ گئے ہیں جو زحل ستارہ سے بھی زیادہ بلند ہیں۔)

علی الانام - بذاک نعتقد

نفی الکرام - کلاهما فرد

ان الحماه - فی ایکها تتد

قل ھل علم ۔ ادھل عھد ۔ او کان کالمعتصم ۔ والمعتضد ۔ ملکان

(ہر مخلوق کو اس بات پر اعتماد ہو پس شرفا ہیں وہ دونوں یکتائے روزگار ہیں،

کبوتر درختوں پر گاتے ہیں :-

تو کہہ دے کیا کسی کو معلوم ہے یا کسی کے ذہن میں ہے یا کبھی ہوئے ہیں معتصم اور معتضد جیسے

دو بادشاہ۔)

مدرسہ سراج العلوم جھنڈا نگر نیپال

مدرسہ سراج العلوم جھنڈا نگر ۱۹۱۴ء سے دینی و عربی تعلیم کی خدمت انجام دے رہا ہے۔ شروع ہی میں اس درس گاہ کے بانی حاجی نعمت اللہ صاحب مرحوم نے موضع سونپور میں ۱۲۷ بیگہ زمین اس پر وقف کر دی تھی، اسی کی آمدنی اور کسی قدر ارباب خیر کے زر اعانہ سے اس کا خرچ چلتا تھا، کچھ دن ہوئے کہ حکومت نیپال نے اپنے ایک ملکی قانون کے تحت اس کو اپنے قبضہ میں کر لیا تھا۔ جس کے واگذاشت کرانے میں مدرسہ کا ہزاروں روپیہ خرچ ہو گیا، ابھی مدرسہ اس کے اخراجات سے سنبھلنے بھی نہ پایا تھا، کہ آتش زدگی کا حادثہ پیش آ گیا جس سے اس کا سارا اثاثہ جس میں ۵ طلبہ کا سال بھر کا راشن تھا مدرسہ سے متعلق بہت سے مکانات تھے جل کر خاکستر ہو گئے، امید ہے کہ اس مصیبت میں اہل خیر حضرات پہلے سے کہیں زیادہ اپنے پرجوش تعاون اور فیاضانہ امداد سے کارکنان مدرسہ کا ہاتھ بٹائیں گے،

عبد الرؤف رحمانی ناظم مدرسہ

کیر آف خان کلاتھ ہاؤس بڑھنی ضلع بستی

خریطۂ جواہر

از شاہ معین الدین احمد ندوی

(۶)

ابوطالب کلیم۔ لالہ داغ است از فغان بلبل و گل بیخبر

آشنا رحمے نکرد و ما دل بیگانہ سوخت

بلبل کی فغاں سے لالہ کے دل میں داغ پڑ گیا ہے مگر پھول بے خبر ہے، آشنا یعنی پھول کو تو رحم نہیں آیا لیکن بیگانے (لالہ) کا دل فغاں کے اثر سے جل گیا،

از بہاں بزم کہ جز من دگرے راہ نداشت ۔۔۔ بایدم رفت کہ بہر دگراں جا باشد

اب اس بزم سے جس میں میرے سوا کسی دوسرے کا گذر نہ تھا، مجھے چلا جانا چاہیے تاکہ دوسروں کے لیے جگہ خالی ہو۔

ہمتم ہست رسا بختم اگر کوتاہ است ۔۔۔ پشت پایم رسد ار دست بدنیا نرسد

گو میری قسمت کوتاہ ہے لیکن میری ہمت رسا اور بلند ہے، اگر میرا ہاتھ دنیا تک نہیں پہنچ سکتا تو میرا تلوا تو پہنچ سکتا ہے، یعنی میں اپنی عالی ہمتی سے دنیا کو ٹھکرا سکتا ہوں۔

کلیم۔ یک نفس فرصت و صد حرف گرہ در خاطر ۔۔۔ وائے گر گریہ نہ آید بمدد گاری دل

داستان غم بیان کرنے کے لیے فرصت تو ایک دم کی ہے اور دل میں سیکڑوں خیالات بھرے ہیں، اس وقت گریہ ہی دل کی ترجمانی میں مدد دے سکتا ہے، اگر وہ بھی مدد نہ کرے تو کیسی بے بسی ہے۔

انچہ من دیدم ز دشمن ہم جدائی مشکل است — میخلد در دل گر از پا خار بیروں می کنم

دشمن (مراد محبوب) سے مجھ پر جو کچھ گذری ہے اس کو چھوڑنا بھی مشکل ہے، اگر پاؤں سے کانٹا نکالتا ہوں تو دل میں چبھنے لگتا ہے، یعنی محبوب کے ظلم کو چھوڑنا بھی دشوار ہے، اس کی علیحدگی دل پر اور بھی بنجاتی ہے،

محمد کاظم قمی۔ یک نالۂ مستانہ زجائے نشنیدیم — ویران شود آں شہر کہ میخانہ ندارد

کسی جگہ سے ایک نالۂ مستانہ بھی سننے میں نہیں آیا، اس شہر کا ویران ہی ہو جانا ہی بہتر ہو، جہاں میخانہ ہو، یہ شعر حقیقت پر بھی محمول کیا جا سکتا ہے کہ جہاں کوئی اہلِ دل نہ ہو اس کو ویران ہی ہو جانا چاہیے،

کاظمائی تبریزی۔ باکم ز ننگ نیست کہ مستم گرفتہ اند — واغم ازیں کہ شیشہ ز دستم گرفتہ اند

مجھکو اس رسوائی کا خوف نہیں ہے کہ مجھے مستی کی حالت میں گرفتار کیا گیا، غم اس کا ہے کہ شراب کا شیشہ میرے ہاتھوں سے چھین لیا،

حسن بیگ گرامی۔ بوئے تو با نسیم بہار آشنا نشد — گل را شگفت و بند قبائے تو وانشد

تیری خوشبو نسیم بہار سے آشنا نہیں ہوئی کیونکہ نسیم بہار کے اثر سے پھول تو کھل گئے مگر تیرا بند قبا نہیں کھلا،

کاکائی قزوینی۔ ہرکس ز محفل تو نصیبے برد بقدر — من نیز بے نصیب نیم اشک می برم

ہر شخص کو تیری محفل سے اس کی قسمت کا حصہ ملتا ہے، میں بھی محروم نہیں ہوں، میری قسمت کے حصہ میں رشک آیا ہے،

شیخ سعد اللہ گلشن۔ سر دیوانگی سلامت باد — راز ما را چہ پردہ پوشی کرد

خدا دیوانگی کو سلامت رکھے، اس نے میرے راز کی کیسی پردہ پوشی کی ہے، کیونکہ دیوانگی میں

ہر عیب چھپ جاتا ہے،

مرزا گرامی۔ چو شمع شکوہ گرامی ز غیر نیست مرا — ہر انچہ دیدہ ام از چشم خویشتن دیدم

گرامی شمع کی طرح مجھے کسی دوسرے کا شکوہ نہیں ہے، جو کچھ میں نے دیکھا ہے اور جو مجھ پر گذری ہے وہ سب میری آنکھوں کا قصور ہے، اسی نے مصیبت میں مبتلا کیا ہے،

لطفی شیرازی۔ شادی در دل زدہ ز دروں درد ندا داد — کایں خلوت عشق است کسی بار نداد

خوشی نے دل کے دروازے پر دستک دی تو اندر سے درد نے آواز دی کہ یہ عشق کی خلوت ہے، یہاں کسی کو بار نہیں مل سکتا، اہل درد ہی یہاں آسکتے ہیں۔

مسعود قمی۔ گفتمش سالہا بخاک رہت — سودہ ام رُخ، خویش گفت چہ سود

میں نے محبوب سے کہا کہ میں نے برسوں تیری راہ کی خاک پر منہ رگڑا ہے، اس نے جواب دیا اس سے کیا فائدہ ہوا، اس شعر میں سودہ اور سود کی تجنیس سے لطف پیدا کیا ہے۔

بد خو مکن از بخشش دشنام کساں را — ایں تحفہ تعلق بدعا گوئے تو باشد

دشنام کی بخشش سے لوگوں کی عادت نہ بگاڑ، یہ تحفہ تو خاص تیرے دعاگو (یعنی میرا) کا حصہ ہے، اس شعر میں "بخشش دشنام" "تحفہ" اور دعاگو نے بڑا لطف پیدا کر دیا ہے۔

میر مقبول قمی۔ بجز آنکہ جاں گدازی تو نیست ہیچ سودم — برو اے غم از دل کہ ترا ہم آزمودم

غم سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ تجھکو بھی آزما کر دیکھ لیا، جاں گدازی کے سوا تجھ سے کچھ حاصل نہیں تو بھی دل سے نکل جا۔

پُر از خونناب حسرت شد دو چشم اشکبار من — یکے بر روز من گرید یکے بر روزگار من

میری دونوں اشکبار آنکھیں حسرت کے خوناب سے بھری ہوئی ہیں، ایک میرے دن کی حالت پر روتی ہے دوسری روزگار کے حال پر، اس میں صرف روز اور روزگار کی تجنیس ہے۔

مرزا قلی میلی۔ دم آخر است دشمن بمنش گذار یکدم ‏— کہ بصد ہزار حسرت بہ تومی گذارم اورا

رقیب سے کہتا ہے کہ میرا وقت آخر ہے، اس وقت تو محبوب کو ایک لمحہ کے لیے میرے لیے چھوڑ دے، کیونکہ میں ہزاروں حسرتوں کے ساتھ اس کو ہمیشہ کے لیے تیرے لیے چھوڑ رہا ہوں،

سازد خموش تا من حسرت فزودہ را ‏— گوید شنیدہ ام سخن ناشنیدہ را

مجھ حسرت زدہ کو خاموش کرنے کیلئے محبوب کہہ دیتا ہے کہ ۔۔۔ میں نے بے سنی بات کو سن لیا ہے، وہ یا میری داستان سننا نہیں چاہتا یا بغیر کہے سمجھ جاتا ہے۔

تو با رقیبی و میلی تغافلے دارد ‏— تغافلے کہ کم از صد ہزار حسرت نیست

تو رقیب کے ساتھ ہے اور میلی جان بوجھکر اس سے تغافل اور چشم پوشی کر رہا ہے، اس لیے اس کا یہ تغافل بھی سیکڑوں حسرتوں سے کم نہیں ہے، وہ بظاہر تو تغافل برت رہا ہے، لیکن اس کا دل اس منظر سے خون ہے،

از ہلاکم ہر دم اظہار پشیمانی کند ‏— ایں سخن از بہر تسکین دل ناشاد کیست

محبوب میری ہلاکت پر ہر دم پشیمانی ظاہر کرتا ہے آخر اس سے کس کے دل ناشاد کی تسکین مقصود ہے، عاشق جس کی تسلی مقصود تھی وہ تو ختم ہو چکا،

میرم از شوق و بسوئے تو نیایم کہ مباد ‏— بیخودیہائے دلم پیش تو شرمندہ کند

میں تیرے شوق میں مرا جاتا ہوں مگر اس خوف سے تیرے پاس نہیں جاتا کہ میرے دل کی بیتابی تیرے سامنے مجھے شرمندہ نہ کردے معلوم نہیں اضطراب میں کیا کر بیٹھے۔

بخت اگر در خواب یکدم ہمدم یارم کند ‏— دل طپد از ذوق چندانکہ بیدارم کند

اگر کبھی قسمت محبوب کو ایک لمحہ کے لیے خواب میں بھی دکھاتی ہے تو دل وفور ذوق میں اتنا تڑپتا ہے کہ بیدار کر دیتا ہے اور خواب میں بھی لطف ملاقات حاصل نہیں ہونے پاتا۔

در خواب ندیدہ بود میلی ‏— آسودگی کہ در لحد دید

میلی کو خواب میں بھی وہ آسودگی حاصل نہیں ہوئی جو آسودگی لحد میں ملی،

دانستہ کہ عشق تو باجاں نمیرد ‏— کز خاک تشنگاں گذری سرگراں ہنوز

شاید تجھکو یہ یقین ہے کہ عشق عاشق کے مرجانے سے نہیں چلا جاتا، اسی لیے تشنگان محبت کی خاک سے ابتک سرگراں گذرتا ہے،

تو درد دلی تمام میلی ‏— کس با چو توئی چرا نشیند

میلی تو تو سراپا درد دل ہے اسلیے کوئی تیرے جیسے شخص کے پاس کیوں بیٹھنے لگا،

پس از عمر یکہ بنشینم بصد تقریب در بزمش ‏— سوال از مدعا من کند تا زود برخیزد

مدتوں کے بعد جب سیکڑوں تقریبوں سے اس کی بزم میں بیٹھنے کا موقع ملتا ہے تو میرا مدعا پوچھنے لگتا ہے تاکہ جلد اٹھ جاؤں:

ظاہر نکردہ ام بتو وارستگی ہنوز ‏— چوں بر خود اعتماد تمامے نیافتم

میں نے تجھ سے اپنی وارستگی ابتک اس لیے نہیں بیان کی کہ مجھکو اپنے اوپر پورا اعتماد نہیں ہے، ایسا نہ ہو کہ تجھے دیکھکر میری وارستگی قابو میں نہ رہے، اور تیری آزردگی کا سبب بنجائے۔

ترسم ز بیوفائی خود منفعل شدی ‏— گر گر تو امید واری خویشتن بیاں کنم

میں اس ڈر سے اپنی آرزوئیں اور تمنائیں تجھ سے نہیں بیان کرتا کہ اس کو سنکر تجھے اپنی بیوفائی پر شرمندگی نہ ہو،

میروم از سر کوئے تو ولے ہر گام ‏— از وبحسرت بقفا میکنم و میگریم

میں تیری گلی سے تو جا رہا ہوں مگر ہر قدم پر حسرت سے مڑ مڑ کر دیکھتا اور روتا جاتا ہوں.

اگر ناخواندہ می آیم بہ بزمت رو متاب از من ‏— تو ہم دانستہ باشی از کمال اضطراب من

اگر میں تیری بزم میں ناخواندہ چلا آتا ہوں تو مجھ سے منہ نہ پھیر کیونکہ تو میری بیقراری کی
شدت سے واقف ہے جس سے مجبور ہو کر آنا پڑا۔

میل داری کہ بمیرند جہانے بہوس ... از وفا نیست کہ بر تربتِ من می گذری

میری تربت پر تیرا آنا وفا کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ اس لیے آتا ہے کہ ایک جہان اس کو
دیکھکر رشک و ہوس میں مرجائے، یہ بدگمانی کی انتہا ہے۔

افگندہ ام ترا بزبانہا و خوش دلم ... کز شرم آں نگاہ بہ مردم نمی کنی

میں نے لوگوں میں تیرا شہرہ کر دیا ہے، اور اس سے خوش ہوں کہ اس شہرت کی شرم
کی وجہ سے تو کسی دوسرے پر نگاہ نہ ڈالے گا۔

محتشم کاشی۔ بجرمے کاش بپیشش متہم گردم کہ ہر ساعت ... بدست و پائیش افتم بہر در خواہ گناہ خود

کاش کسی جرم میں متہم ہو کر اس کے سامنے جاؤں تاکہ اس بہانہ سے ہر گھڑی گناہ کی عذر خواہی
میں اس کے ہاتھ پاؤں پڑنے کا موقع ملے۔

چو غافل از اجل صیدے سوئے صیاد می آید ... نخستیں رفتن خویشم باں کو یاد می آید

جب موت سے غافل کسی شکار کو صیاد کی طرف جاتا دیکھتا ہوں تو اس کی گلی میں اپنا پہلی مرتبہ
جانا یاد آتا ہے، کہ غریب یہ بھی میری طرح گرفتار ہوگا۔

ز رفتن تو من از عیش بے نصیب شدم ... سفر تو کردی و من در وطن غریب شدم

تیرے جانے سے میں زندگی کے لطف سے محروم ہو گیا، تو نے کیا سفر کیا کہ میں اپنے وطن میں
مسافر ہو گیا، غالباً یہ شعر بیوی کی موت پر شاعر نے کہا ہے۔

خوش آں ساعت کہ خنداں پیش آں سیمیں بدن میرم
تو باشی بر سر بالیں من گریاں و من میرم

وہ وقت بھی کیسا خوش آیند ہو کہ میں اس سیمتن کے سامنے ہنستا ہوا جان دوں
تو میرے سرہانے رو رہا ہو اور میں مر رہا ہوں۔

بمن چنداں گناہ از بدگمانی میکند نسبت ... کہ من ہم در گماں افتادہ پندارم گنہگارم

محبوب نے بدگمانی سے میری جانب اتنے گناہ منسوب کر دیے ہیں کہ مجھے خود اپنے گنہگار ہونے
کا گمان ہو گیا ہے۔

محمد حسین محزوں۔ چرا بیہودہ شادی در دل من خانہ می سازد
ہمیں دم سیل غم می آید و ویران می سازد

میرے دل میں خوشی بیکار گھر بناتی ہے، کیونکہ اسی وقت غم کا سیلاب آکر اسکو ویران
کر دیتا ہے، یعنی اگر کبھی کوئی خوشی بھی حاصل ہوتی تو غم کا پہاڑ اس کو ملیامیٹ کر دیتا ہے۔

میر محمد مومن۔ ز صد لشکر ندیدیم آں خرابی کز غمش دیدیم ... الٰہی کاروان عشق جائے بار نکشاید

سیکڑوں فوجوں کی تاخت سے بھی میں نے وہ ویرانی نہیں دیکھی جو اس کے غم سے دیکھی
خدایا عشق کا قافلہ کہیں نہ اترے، جہاں یہ اترا وہاں ویرانی آئی۔

حافظ محمد۔ مریض عشق را نازم کہ گر بہر علاج او ... مسیحا بر سر بالیں رود بیمار می آید

مریض عشق کی قسمت ناز کے قابل ہے کہ اگر مسیحا اس کے علاج کے لیے سرہانے جاتا ہے
تو بیمار ہو کر لوٹتا ہے، یعنی اس کی حالت دیکھکر خود بیمار ہو جاتا ہے۔

ملا رشیدی ہروی۔ بسیار ز حد می گذرد گرمی مجلس ... دل سوختۂ در پس دیوار نباشد

کیا بات ہے کہ آج گرمی مجلس حد سے زیادہ بڑھ رہی ہے، معلوم ہوتا ہے کہ دیوار کے
پیچھے کوئی دل جلا ہے، یہ گرمی مجلس اسی کا اثر ہے۔

حکیم رکن الدین مسیح۔ آنقدر خاک کہ باید بسر از دست تو کرد ... حکنم آہ کہ در دامن ایں صحرا نیست

جتنی خاک تیرے ہاتھوں یا تیری یاد میں سر پر ڈالنا چاہیے ، افسوس کہ وہ اس صحرا کے دامن میں نہیں ہے ، یعنی صحرا کی وسعت میری دیوانگی کے لیے تنگ ہے ،

کس نمیداند کہ خواہد در کجا مردن دلے — بندہ می دانم کہ خواہم در تہِ پائے تو مُرد

کسی کو اس کی خبر نہیں کہ اس کی موت کہاں آئے گی لیکن مجھے معلوم ہے کہ تیرے قدموں کے نیچے جان دوں گا ،

ہنوز از خاک کوئے او غبارے در کفن دارم — بہشت آں بہ کہ بر من جلوہ را بسیار نفروشد

ابتک اس کی گلی کی خاک کا اثر میرے کفن میں موجود ہے ، میرے لیے وہی بہشت بہتر ہے کہ مجھ پر زیادہ جلوہ فروشی نہ کرے ، یعنی میرے لیے اس کے کوچہ کی خاک کافی ہے ، بہشت کی ضرورت نہیں ،

بکام دل ندیدم یک نفس در مدت عمرش — کنوں چشمیکہ دارم بر نگاہ واپسیں دارم

اپنی پوری زندگی میں ایک لمحہ کے لیے بھی دل کی آرزو بر نہ آئی ، اب جو کچھ امید ہے وہ نگاہ واپسیں سے ہے کہ اسکے بعد پھر کوئی آرزو ہی باقی نہ رہے گی ،

مشقی نگاری ۔ ز کویش می گذشتم خار در پایم شکست آنجا — بحمد اللہ کہ تقریبے شد از بہر نشست آنجا

میں اس کی گلی سے گذر رہا تھا کہ پاؤں میں ایک کانٹا ٹوٹ گیا ، خدا کا شکر ہے کہ اس سے اس گلی میں ٹھہرنے کی ایک تقریب پیدا ہو گئی ۔

درغمت رشتہ عمرے کہ بکف بود مرا — صرف در دوختن چاک گریباں شدہ است

غم میں عمر کا جو رشتہ (تاگا) میرے ہاتھ میں رہ گیا تھا وہ بھی چاک گریباں کے سینے میں صرف ہو گیا یعنی تیرے غم محبت میں جتنی اور جیسی عمر بھی میسر آئی وہ بھی دیوانگی کی نذر ہو گئی ۔

[illegible] ۔ یا کم از آشوب محشر نیست می ترسم کہ باز — ہمچو شمع کشتہ باید زندگی از سر گرفت

مجھے آشوب محشر کا ڈر نہیں ہے ، ڈر اس کا ہے کہ بجھی ہوئی شمع کی طرح پھر نئے سرے سے زندگی کا درد سر برداشت کرنا پڑے گا ۔

چوں زخم غنچہ زخم دلم بخیہ گیر نیست — برگ گل است سینۂ عاشق حریر نیست

غنچہ کے زخم کی طرح میرے دل کے زخم میں بھی ٹانکا نہیں لگ سکتا ، عاشق کا سینہ پھول کی پنکھڑی ہے ، حریر نہیں جس میں ٹانکا لگایا جا سکے ،

خزاں رسید و کسے آشنائے عیش نشد — بہار ہمچو غریباں ازیں دیار گذشت

خزاں کا موسم آگیا اور کسی کو لطف زندگی حاصل نہ ہو سکا ، بہار تو آئی لیکن اجنبی مسافر کی طرح اس دیار سے گذر گئی ، کسی کو اس سے فائدہ نہیں پہنچا ، یعنی دنیا کی بہار سے کسی کو بھی پورا لطف اٹھانے کا موقع نہ سکا ،

گیرم کہ ز قید قفس آزاد کنندم — کو قوت پرواز کہ توانم بچمن رفت

میں نے مانا کہ مجھکو قید قفس سے آزاد کر دیں گے لیکن اب وہ قوت پرواز کہاں کہ اڑ کر چمن تک پہنچ سکوں ،

یارب آنکس کہ دم تیغ ترا آب داد — زحمت تشنگی روز قیامت نکشد

خدایا جس نے قاتل کی تلوار کو آب دی ہے وہ قیامت کے دن پیاس کی زحمت سے محفوظ رہے ، یعنی قاتل کو قیامت میں کوئی گزند نہ پہنچے ، اس شعر میں آب اور تشنگی سے لطف پیدا کیا گیا ہے ،

میا از خانہ بیروں گو جہاں بیت الحزن باشد — نمیخواہم ترا بیند کسے گر چشم من باشد

محبوب سے کہتا ہے کہ خواہ ساری دنیا غم و الم سے بھر جائے مگر تو اپنے گھر سے باہر قدم نہ نکال کیونکہ میں یہ پسند نہیں کرتا کہ تجھ پر کسی کی نگاہ پڑے خواہ وہ میری آنکھ کیوں نہ ہو ۔

اس پر بو علی قلندرؒ کا یہ شعر یاد آ گیا،

غیرت از چشم برم روئے تو دیدن نہ دہم
گوش را نیز حدیث تو شنیدن نہ دہم

مرا بوقت گل از باغ در قفس کردند
بگلشنم نفرستید تا بہار شود

مجھکو موسم گل میں قفس میں قید کیا ہے اس لیے جب تک پھر بہار نہ آجائے مجھے

گلشن میں نہ لیجاؤ کہ خزاں کا منظر نہ دیکھوں۔

ز شوق سیر گلزار آنقدر فرصت نمی یابم
کہ در پائے گلے بہ نشینم و خارے برُں آرم

گلزار کی سیر کے شوق سے اتنی فرصت بھی نہیں ملی کہ کسی پھول کے پاؤں کے پاس بیٹھکر

کانٹا نکال سکوں، یعنی دنیا کی دلفریبیوں میں اتنا کھو گیا کہ دوسرے کاموں کی طرف توجہ

کرنے کی فرصت نہیں ملی، یہ شعر لاجواب ہے،

زباندان نگاہم گفتگوئے نازمی دانم
زیک جنبیدن مژگاں بفکر صد ادا فتم

میں نگاہوں کی زباں کا زباںداں اور ناز کی باتوں کا رمز شناس ہوں اسلیے

محبوب کی مژگاں کی ایک جنبش سے سیکڑوں اداؤں کے خیال میں ڈوب جاتا ہوں۔

دلم در دام مرغاں قیامت الفتے دارد
ازاں ایام می ترسم کہ تنہا در قفس باشم

مجھے مرغان قیامت کے دام سے تو الفت ہے البتہ اس دن سے ڈرتا ہوں کہ قفس

میں تنہا رہنا پڑے، یعنی قیامت کا ہنگامہ اور اس کی دار و گیر تو مرگ انبوہ جشنے دارد

کی حیثیت رکھتی ہے، قبر کی تنہائی سے البتہ ڈرتا ہوں،

منم آں مرغ گرفتار کہ در صحن چمن
اگر آزاد کنندم بقفس می آیم

میں وہ مرغ گرفتار ہوں کہ اگر چمن میں مجھے آزاد بھی کر دیتے ہیں تو میں قفس میں

لوٹ آتا ہوں یعنی قید قفس کا اتنا عادی ہو گیا ہوں اور اس سے اتنی الفت ہو گئی ہے کہ

آزادی ملنے کے بعد بھی اس کو نہیں چھوڑتا۔

میر مومن۔ بگوش پنبہ نہم از صدائے خندۂ گل
دماغ نالۂ بلبل دریں بہار کجاست

اب دماغ اتنا نازک ہو گیا ہے کہ موسم بہار میں خندۂ گل کی صدا سننے کی بھی تاب

نہیں ہے، اس لیے کانوں میں روئی ٹھونس لیتا ہوں، ایسی حالت میں بلبل کا نالہ سننے کا دماغ

کہاں سے آئے،

چیزیکہ خاطرے بشگفاند جہاں نداشت
مے زاں حرام شد کہ دلے شاد می کند

ایسی چیز جس سے دل شگفتہ ہو دنیا کے پاس نہیں تھی، شراب اس لیے حرام ہو گئی کہ

اس سے دل شاد ہوتا تھا، تاکہ کسی قسم کی خوشی و شگفتگی کا سامان باقی نہ رہے،

اے گل آں زر کہ تو داری اگر از من باشد
میدہم کز قفسے بلبلے آزاد کنم

پھول سے کہتا ہے کہ تیرے پاس جو زر (زر گل) ہے اگر میرے پاس ہوتا تو میں اس کو

کسی بلبل کو قفس سے آزاد کرانے میں صرف کرتا مگر تجھ سے یہ نہیں ہوتا،

نااائی مشہودی۔ طے شد بہار عمر و غم دیر سالہ ماند
چوں داغ لالہ دُردِ میم در پیالہ ماند

عمر کی بہار آخر ہو گئی یعنی عمر تمام ہو گئی مگر دیرینہ غم باقی رہ گیا اور لالہ کے داغ کی طرح پیالہ

میں صرف تلچھٹ رہ گئی یعنی زندگی کے لطف ختم ہو گئے صرف غم باقی رہ گیا،

مارا دماغ گلشن و باغ نماندہ است
اے گل برو کہ دماغے نماندہ است

پھولوں سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ اب مجھ میں گلشن اور باغ کی ہوس باقی نہیں ہے اور

تجھ سے لطف اندوزی کا دماغ ہی نہیں رہ گیا ہے، اس لیے تو چلا جا۔

انشاؔء کا شعر ہے:

نہ چھیڑ اے نکہت باد بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں۔

تک تھی۔ ذرا یہ بدگمانی ملاحظہ ہو:-

رہین بوعدۂ وصلت امید وار کند
کہ آنچہ ہجر کردہ است انتظار کند

معشوق مجھے اس لیے وصل کی امید دلاتا ہے کہ جو تکلیف و مصیبت مجھ پر ہجر میں نہیں گذری وہ انتظار میں گذر جائے۔

اسی سے ملتا جلتا ہوا یہ شعر ہے:-

غرض ایں بود کہ از ذوق بمیرم ورنہ
ایں ستم دیدہ سزاوار پیام تو نبود

یہ ستم دیدہ تیرے پیام کے لائق نہیں تھا، تیرے پیام بھیجنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ میں اس کے ذوق ولذت کے لطف میں مرجاؤں۔

ندارم قوت رفتن در آں کو بخت آنم کو
کہ گوید ناتوانے واستم اوراچہ پیش آمد

مجھ میں محبوب کے کوچہ تک جانے کی طاقت نہیں ہے، مگر یہ قسمت کہاں کہ وہ پوچھے میرا ایک ناتواں تھا، اس کو کیا واقعہ پیش آیا کہ نہیں آسکا۔

بنوع چشم او شد وقت کشتن عذرخواہ من
کہ بیجرمی بخوں غلطید از رشکِ گناہ من

مجھے قتل کرتے وقت اس کی نگاہوں نے کچھ اس طرح سے معذرت کی کہ بیگناہی میرے گناہ کے رشک میں خون میں لوٹنے لگی، یعنی اس کی معذرت پر بے گناہی کو رشک آگیا کہ اس نے گناہ کیوں نہیں کیا کہ معشوق کی معذرت کی لذت سے لطف اندوز ہوتی۔

(باقی)

وَفَیات

چودھری خلیق الزماں مرحوم

افسوس ہے کہ گذشتہ مہینہ چودھری خلیق الزماں مرحوم کا کراچی میں انتقال ہوگیا۔ مرحوم اُن لوگوں میں تھے جن کی پوری زندگی سیاسی اور قومی کاموں میں گذری، سیاست کا چسکا ان کو طالب علمی ہی کے زمانہ سے تھا، چنانچہ جنگ بلقان کے زمانہ میں ہندوستان سے جو طبی وفد ڈاکٹر انصاری مرحوم کی قیادت میں ٹرکی گیا اس میں جو نوجوان شامل ہوئے تھے اُن میں ایک چودھری صاحب بھی تھے، کئی مرتبہ لکھنؤ میونسپلٹی کے چیرمین ہوئے۔ ان کی چیرمینی کا دور ایک یادگار دور تھا، اسی زمانہ میں خلافت اور ترک موالات کی تحریک شروع ہوئی، اس میں اس سرگرمی سے حصہ لیا کہ صوبے کے لیڈروں میں ان کا شمار ہونے لگا، ایک مدت تک کانگریس میں رہے، پنڈت موتی لال کے معتمد علیہ اور جواہر لال کے خاص رفقاء میں تھے، کانگریس میں بھی نمایاں مقام حاصل کیا، چنانچہ ۱۹۲۹ء میں جب کانگریس کے لیڈروں کی گرفتاری کا سلسلہ شروع ہوا تو آخر میں ان کو کانگریس کا ڈکٹیٹر مقرر کیا گیا تھا۔

پھر مسلم لیگ میں شامل ہوگئے، اور پاکستان کی تحریک میں چند دنوں میں آل انڈیا لیڈر کی حیثیت حاصل کرلی چنانچہ پاکستان کے بانیوں میں انکا شمار ہوتا ہے، قیام پاکستان کے بعد کراچی چلے گئے، یہاں بھی انکو بڑے بڑے عہدے حاصل ہوئے مختلف اوقات میں مسلم لیگ کے صدر، مشرقی پاکستان کے گورنر اور انڈونیشیا کے سفیر مقرر ہوئے مگر مسٹر جناح ان سے

خوش نہ تھے اس لئے وہ پاکستان کی سیاست میں اثر انداز نہ ہو سکے اور آخر میں گوشہ نشینی کی زندگی اختیار کرلی تھی اور اسی پر انکا خاتمہ ہوا، چودھری صاحب کی زندگی قلندرانہ تھی، وہ وکیل تھے، انکے ماموں اور خسر مولوی محمد نسیم صاحب لکھنؤ کے چوٹی کے وکیل اور ان کے صاحبزادے محمد وسیم صاحب نامور بیرسٹر تھے، لیکن چودھری صاحب کو سیاست کا ایسا چسکا تھا کہ انکا سارا وقت اسی میں گذرتا تھا اسلئے وکالت کی طرف توجہ کرنے کا موقع کم ملتا تھا، ان کی وکالت برائے نام تھی، اس سلسلہ میں ایک واقعہ یاد آگیا، ایک مرتبہ وہ مسلم لیگ کے دورے کے سلسلہ میں اعظم گڈھ آئے تھے۔ ایک گفتگو میں سید صاحب مرحوم سے کہنے لگے کہ مولانا میرے ساتھیوں نے وکالت سے لاکھوں پیدا کئے اور میں گھر تک نہ بنوا سکا، ابھی چند سال ہوئے انھوں نے شاہراہ پاکستان کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی جس میں قیام پاکستان کی سرگذشت تحریر کی تھی، انکی موت سے ایک اہم یادگار مٹ گئی، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔

مولانا عبد الصمد صاحب رحمانی مرحوم

دوسرا حادثہ مولانا عبد الصمد صاحب رحمانی نائب امیر شریعت صوبہ بہار و اڑیسہ کا ہے، وہ بھی پرانی یادگار، اس دور کے نامور عالم اور ملک و ملت کے پرانے خدمت گذار تھے، ملکی و ملی تحریکات میں ان کا نمایاں حصہ رہا، خلافت اور ترک موالات کی تحریک اور ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد میں مولانا سجاد بہاری مرحوم کے رفیق کار تھے، ان کی وفات سے ایک قدیم یادگار اٹھ گئی، اللہ تعالیٰ ان کے مدارج بلند فرمائے۔

باب التقریظ والانتقاد

سترھویں صدی عیسوی میں ہندوستان

کی

بعض اہم نثری تصانیف

از سید صباح الدین عبد الرحمن

مذکورہ بالا کتاب دراصل پی۔ ایچ۔ ڈی کا وہ مقالہ ہے، جس کو جناب ممتاز علی خاں نے مسلم یونیورسٹی علی گڈھ میں پیش کیا، یہ ڈاکٹر نذیر احمد صدر شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی کی نگرانی میں لکھا گیا، جو اب تک معلوم نہیں کتنے پی۔ ایچ۔ ڈی بنا چکے ہیں، ڈاکٹر نذیر احمد صاحب نے اپنی رہنمائی میں جو مقالات تیار کرائے ہیں، ان میں بڑا تنوع ہے، ہندوستان میں شروع سے جو ادیب اور شاعر پیدا ہوتے گئے، ان کی طرف بھی ڈاکٹر نذیر احمد کی توجہ ہے، خوشی کی بات ہے کہ ان کے اس حسن توجہ کی وجہ سے ہندوستان کے بہت سے ایسے شاعر اور ادیب منظر عام پر آرہے ہیں جو نقش و نگار طاق نسیاں بن چکے تھے، اسی کے ساتھ ان کو سبک ہندی سے بھی لگاؤ ہے، اسلئے ہندوستان کے اندر جو ادبی، علمی اور شعری کارنامے انجام پاتے گئے، ان کی اہمیت بھی ان کی نگرانی میں ظاہر ہو رہی ہے،

زیر نظر کتاب میں جناب ممتاز علی خاں صاحب نے سترھویں صدی عیسوی میں ہندوستان

کی بعض اہم نثری تصانیف کا بڑا اچھا تجزیہ کیا ہے، پی۔ ایچ۔ ڈی کے مقالات لکھنے کے اب خاص خاص آداب مرتب کر لئے گئے ہیں، جو عام تصانیف سے کچھ علیحدہ ہوتے ہیں، مثلاً جس عہد کی علمی و ادبی تصانیف زیر بحث لائی جاتی ہیں، اس کے پچھلے سو برس یا اس سے زیادہ مدت کی تاریخی، سیاسی، علمی اور معاشرتی اور ثقافتی سرگرمیوں کا احاطہ بھی ضرور کیا جاتا ہے، اس سے اصل موضوع کو کچھ مدد ضرور مل جاتی ہے، مگر مدد پہنچانے سے زیادہ مقالہ نگار کو تحریری، تحقیقی اور ذہنی ورزش کرانا زیادہ مقصود ہوتا ہے، جو بعض اوقات اعتدال سے اتنا زیادہ تجاوز کر جاتا ہے کہ اصل موضوع کے لئے محنت و کاوش میں کمی پیدا ہو جاتی ہے، زیر نظر کتاب میں بھی ایک تمہید کے بعد پہلا باب غزنویوں کے عہد میں فارسی لٹریچر اور دوسرا باب تیرھویں صدی کے سیاسی، معاشرتی، ثقافتی اور علمی جائزہ پر ہے، اور دوسرے مقالہ نگاروں کی طرح یہ دونوں ابواب زیادہ طویل نہیں ہونے پائے ہیں، اختصار اور جامعیت کے ساتھ تمام ضروری باتیں قلمبند کر دی گئی ہیں، بعض مقامات پر نتائج کے استنباط کرنے میں مقالہ نگار کی پختگی رائے کا اظہار ہوتا ہے، جو اس لئے قابل تعریف ہے کہ یہ انکی پہلی علمی اور تحقیقی کاوش ہے،

اصل موضوع پر تیسرے باب میں فخر مدبر حسن نظامی نیشاپوری (دبطامی) محمد عوفی، منہاج الدین الجوزجانی کے حالات زندگی کے ساتھ ان کی تصانیف کا تجزیاتی مطالعہ ہے، چوتھے باب میں اس زمانہ میں عربی سے فارسی میں جو ترجمے ہوتے گئے، ان پر تبصرہ ہے، ان ترجموں میں چچ نامہ مترجمہ علی بن حامد بن ابی بکر کوفی، احیاء العلوم مترجمہ مجد الدین ابو المعالی سعد بن محمد جرجانی، البیرونی کی کتاب الصیدنہ مترجمہ ابو بکر کاسانی یا کاشانی کا ذکر ہے، موخر الذکر کتاب کا نام البیرونی کی تصانیف کی فہرست میں نظر سے نہیں گذرا، لیکن مقالہ نگار نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، کہ یہ البیرونی ہی کی تصنیف ہے، جو اس نے بہت بعد میں لکھی، مگر خود اس کی تیار کی ہوئی تصانیف میں اس کا ذکر نہیں

آسکا، یہ طب کے موضوع پر ہے،

اس مقالہ کا وہ حصہ زیادہ پسند آیا جہاں مختلف تصانیف کی زبان کی خوبیوں اور خامیوں کی نشاندہی کی گئی ہے، مثلاً فخر مدبر کی تصنیف شجرۂ انساب میں ایسی مثالیں دی گئی ہیں کہ اس کے مصنف نے کہیں طویل اضافت مسلسل کا استعمال کیا ہے، کہیں است جیسے متوالی Recurrence فعل، کہیں جملوں کے ترکیبی الفاظ کو حذف کر دیا ہے، کہیں ماضی استمراری کے بجائے ماضی تمنائی استعمال کیا گیا ہے، کہیں ہا لگا کر صفت مرکب بنائی گئی ہے، کہیں دو صفت کے درمیان واو عطف چھوڑ دیا گیا ہے، کہیں مصدر کے بجائے فعل مرخم استعمال ہوا ہے، کہیں ماضی مطلق کے بجائے مضارع سے ماضی تمنائی بنایا گیا ہے، کہیں اسم اور ضمیر دونوں ساتھ استعمال ہوئے ہیں، جمع بنانے میں کبھی فارسی، کبھی عربی قاعدے سامنے رکھے گئے ہیں، اس زمانہ میں بعض الفاظ اور محاورے اس طرح استعمال ہوئے ہیں جو اب نہیں ہوتے، مثلاً برجیس کے لئے اورمزد، ناہید کے لئے بیدخت، نافرمانی کے لئے بے فرمانی، کامرانی کے لئے دوست کامی، کفار کے لئے اہل کفران، نوازش کے لئے نواختی استعمال ہوئے ہیں، اسی طرح طاعت کردن کے بجائے طاعت داشتن، نگہداشتن کے بجائے تیمار داشتن، آموختن کے بجائے، درس کردن، اضافہ شدن کے بجائے جملہ شدن، سوگند خوردن کے بجائے سوگند یاد کردن، اسلام قبول کردن کے لئے در مسلمانی افتادن وغیرہ استعمال ہوئے ہیں، اسی طرح اس زمانہ کی اور تصانیف میں صرف و نحو کی غرابت یا الفاظ و محاورے کے عجیب معانی کی نشاندہی کی گئی ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مقالہ نگار نے کافی محنت کی ہے، فارسی تصانیف کا اس قسم کا مطالعہ مفقود ہوتا جا رہا ہے، لیکن اس مقالہ میں اسکا اعادہ کر کے ایک اچھی مثال پیش کی گئی ہے،

پہلے جو اچھے نثر نگار ہوتے تھے، وہ خود بخود اچھے شاعر بھی ہو جاتے تھے، مقالہ نگار نے اپنے

موضوع کے نثر نگاروں کی شاعری پر بھی مختصر تبصرہ کیا ہے، لیکن ان کی شاعری پر تبصرہ کرنا ان کے موضوع سے باہر تھا، اس لئے سرسری ذکر کرنے ہی پر اکتفا کیا ہے،

آخر میں ملفوظات خواجگان چشت پر بھی تبصرہ ہے جو اس لحاظ سے قابل قدر ہے کہ مقالہ نگار نے بڑی خوبی سے اس کا تجزیہ کیا ہے کہ کچھ لوگ ان کو بالکل جعلی قرار دیتے ہیں، اور کچھ لوگ ان کو بالکل اصلی سمجھتے ہیں، ان دونوں کو وہ انتہا پسند قرار دیتے ہیں، کچھ لوگ ایسے ہیں جو ان کو نہ جعلی اور نہ اصلی سمجھتے ہیں، بلکہ ان کے متعلق خاموشی اختیار کر لی ہے، لیکن کچھ لوگ ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ ان ملفوظات میں کچھ چیزیں بعد میں اضافہ کر دی گئی ہیں، لیکن مجموعی حیثیت سے وہ جعلی نہیں ہیں، مقالہ نگار نے آخر الذکر لوگوں ہی کی رائے کو زیادہ ترجیح دی ہے، ان کا یہ تبصرہ اس لحاظ سے قابل تعریف ہے کہ علی گڑھ میں رہ کر انھوں نے علی گڑھ کے ان اہل الرائے کے خلاف آواز اٹھائی ہے، جو ان ملفوظات کو بالکل ہی فرضی اور جعلی قرار دیتے ہیں،

یہ مقالہ انگریزی میں ہے، اس کے لب و لہجہ میں بڑی متانت اور سنجیدگی ہے، مقالہ نگار نے اس کو اہل علم کے سامنے پیش کر کے اپنی تحقیقی اور علمی صلاحیت کا ثبوت دیا ہے، امید ہے کہ آیندہ وہ اس سے بہتر تحقیقی اور علمی کاوشوں کے نمونے پیش کر کے اپنی اندرونی صلاحیت کا صحیح مصرف لیں گے، کتاب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی کی طرف سے شائع ہوئی ہے، قیمت کہیں درج نہیں ہے۔

تفسیر ماجدی کے خریداروں کیلئے غیر معمولی رعایت

تفسیر ماجدی کے خریداروں کی سہولت کے لئے صدق جدید بک ایجنسی اسکی خریداری پر ۲۵ فیصدی کمیشن دیگی، تاجروں کو خاص طور سے اس رعایت سے فائدہ اٹھانا چاہئے،

منیجر صدق جدید بک ایجنسی کچہری روڈ۔ لکھنؤ،

مطبوعات جدیدہ

ارمغانِ مالک دو جلدیں ،۔ مرتبہ جناب ڈاکٹر گوپی چند نارنگ صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ کتابت و طباعت عمدہ صفحات ۴۱۲، مجلد مع گرد پوش، قیمت ۳۰ روپیہ، پتہ (۱) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دلی۔ (۲) علمی مجلس، چھتا نواب صاحب، فراشخانہ، دلی۔

اردو کے مشہور مصنف اور غالبیات کے ماہر جناب مالک رام صاحب کو انکی پینسٹھویں ۶۵ سالگرہ کے موقع پر ان کے احباب نے اردو اور انگریزی مضامین کا یہ مجموعہ نذر کیا ہے، یہ مجموعہ دو جلدوں میں ہے، پہلی جلد کے ابتدائی چار مضامین میں مالک رام صاحب کے حالات و سوانح اور علمی و تصنیفی کارناموں کا ذکر ہے، انکے علاوہ ۳۱ مضامین اور ہیں، دوسری جلد میں سترہ ۱۷ مضامین ہیں، ایک مضمون کابل کے آقای محمد اسماعیل مبلغ کا فارسی میں ہے، یہ مختلف النوع علمی، ادبی، تحقیقی اور لسانی مضامین مفید اور پر از معلومات ہیں، مسعود حسن رضوی ادیب، قاضی عبد الودود، امتیاز علی عرشی، ڈاکٹر نذیر احمد اور ڈاکٹر نفیر احمد کے مضامین تحقیقی حیثیت سے اہم اور بلند پایہ ہیں، اقبال اور کارل مارکس (جگن ناتھ آزاد) جامع اور پر مغز مضمون ہے، رادھا کرشنن اور اقبال (یوسف سلیم چشتی) بھی قابل ذکر ہے، ڈاکٹر سید عابد حسین، ڈاکٹر

محمد زبیر صدیقی، خواجہ غلام السیدین مرحوم، ڈاکٹر یوسف حسین خاں، ڈاکٹر محمد حمید اللہ
مولانا عبد السلام خاں رامپوری، ڈاکٹر شوکت سبزواری، محمد عبد الرحمٰن
چغتائی، ڈاکٹر محمد عبد اللہ چغتائی، سید صباح الدین عبد الرحمٰن، مولانا سعید احمد
اکبر آبادی، علی جواد زیدی .... وغیرہ مشاہیر ارباب علم و قلم اور خود فاضل
مرتب کے مضامین بھی اس یادگار مجموعہ میں شامل ہیں، یہ مجموعہ مالک رام صاحب جیسے
ادیب و محقق کے علمی و ادبی خدمات کے اعتراف کی مفید یادگار اور صاحب علم و ذوق کے مطالعہ کے لایق ہے۔

نغمہ والہام مرتبہ جناب میر کاظم علی صاحب برق موسوی تقطیع خورد،
کاغذ کتابت و طباعت بہتر صفحات ۴۰، مجلد قیمت ۵ روپیہ کاچی گوڑہ گڈس
حیدرآباد، آندھرا پردیش،

جناب برق موسوی پرگو شاعر ہیں، ان کو اردو و فارسی دونوں زبانوں میں دسترس حاصل ہے اور وہ دونوں میں طبع آزمائی کرتے ہیں۔ اردو میں انکے کئی منظوم مجموعے چھپ چکے ہیں، زیر نظر مجموعہ بادہ شیراز کی لطافتوں سے معمور نظموں، غزلوں، رباعیات اور حضرت علیؑ کے قصائد منقبت پر مشتمل ہے، اس میں زیادہ تر اخلاقی اور حکیمانہ مضامین سادہ اور موثر انداز میں بیان کئے گئے ہیں، کلام ابتذال و رکاکت سے پاک اور فکر و خیال کی پاکیزگی و بلندی اور طرز ادا کی لطافت و دلکشی سے معمور ہے، منقبت کے قصائد میں مفرط عقیدت کے علاوہ مصنف کے مسلک و عقیدہ کی جھلک بھی ملتی ہے جس سے دوسرے مسلک کے لوگوں کو اتفاق نہیں ہو سکتا، جناب برق کا یہ ذوق ادب قابل داد ہے کہ اس زمانہ میں جب فارسی کا مذاق اٹھتا جا رہا ہے انھوں نے یہ بھولا ہوا سبق یاد دلایا ہے۔

"ض"

مکتبۂ دار المصنفین

سیرۃ النبی، سیر الصحابہ و سیر تابعین و تبع تابعین، تاریخ اسلام، تاریخ ہند، سوانح، ادبی و فلسفیانہ کتابوں اور مولانا شبلی کے مقالات کے مستقل سلسلوں کے علاوہ جو بیحد مقبول ہیں اور جن میں سے ہر ایک کے اب تک کئی کئی اڈیشن شائع ہو چکے ہیں مختلف موضوع پر اور بھی بہت سی کتابیں دار المصنفین نے شائع کی ہیں جن کی مجمل فہرست یہ ہے:-

تاریخ فقہ اسلامی: تاریخ التشریع الاسلامی مؤلفہ علامہ محمد الخضری مرحوم کا دلنشین ترجمہ جس میں فقہ اسلامی کے ہر دور کی خصوصیات بہ تفصیل بیان کی گئی ہیں، ۴۹۰ صفحے قیمت [illegible]

اسلام کا سیاسی نظام: اس میں کتاب و سنت کی روشنی میں اٹھارہ ابواب کے تحت اسلامی دستور کے تقریباً تمام اصولی اور سیاسی پہلو آگئے ہیں، ۳۰۰ صفحے قیمت ۶-۰۰ روپیے

حکمائے اسلام (حصہ اول) پانچویں صدی ہجری تک کے تمام مشہور حکما و فلاسفہ کے سوانح و حالات اور ان کے علمی و فکری کارنامے، ۵۰۴ صفحے، قیمت [illegible]

حکمائے اسلام (حصہ دوم) متوسطین و متاخرین حکمائے اسلام کے حالات اور ان کی علمی خدمات اور فلسفیانہ نظریات کی تفصیل، ۳۵۱ صفحے قیمت ۷-۰۰

طبقات الامم: اندلس کے نامور فاضل صاعد اندلسی کی عربی کتاب کا اردو ترجمہ، ۱۵۸ صفحے قیمت [illegible]

انقلاب الامم ڈاکٹر لیبان کی کتاب کے عربی ترجمہ سر تطور الامم کا ادیبانہ و انشا پردازانہ ترجمہ، ۱۸۸ صفحے، قیمت: ۴-۰۰

ارض القرآن (حصہ اول) سرزمین قرآن یعنی عرب کا جغرافیہ اور قرآن میں جن عرب اقوام و ملل و قبائل کا ذکر ہے، ان کی تاریخی و اثری تحقیق، ۳۲۰ صفحے قیمت ۶-۲۵

ارض القرآن (حصہ دوم) بنو ابراہیم کی تاریخ اور عربوں کے قبل از اسلام تجارت، زبان و مذہب پر تحقیقات و مباحث، ۲۳۰ صفحے قیمت: ۴-۲۵

خطبات مدراس مولانا سید سلیمان ندوی کے سیرت نبوی سے متعلق خطبات کا مجموعہ، جس میں دار المصنفین کے سلسلہ سیرۃ النبی کا پورا خلاصہ اور حیات نبوی کے تمام پہلو آگئے ہیں، ۲۰۰ صفحے قیمت [illegible]

(منیجر دار المصنفین اعظم گڑھ)